بدعتی دعاؤں سے بچیے

تالیف

ابوطاہر بن عزیز الرحمٰن سلفی

بدعتی دعاؤں سے بچیئے

تالیف

ابو طاہر بن عزیز الرحمٰن سلفی

استاد جامعہ اسلامیہ سلفیہ عبداللہ پور
صاحب گنج، جھارکھنڈ

ناشر

الکتاب انٹرنیشنل

بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۲۵

نام کتاب : بدعتی دعاؤں سے بچئے

نام مصنف : ابوطاہر بن عزیز الرحمن سلفی

ناشر : الکتاب انٹرنیشنل جامعہ نگر نئی دہلی۔۲۵

صفحات : ۱۱۹

سن اشاعت : ۲۰۰۹ء

قیمت : ....

ملنے کے پتے:

۱۔ اہل حدیث جنرل لائبریری شریکنڈ، برہروا، صاحب گنج، جھارکھنڈ

۲۔ مکتبہ ترجمان 4116 اردو بازار دہلی۔۶

۳۔ دار المعارف محمد علی بلڈنگ بھنڈی بازار ممبئی

۴۔ دار الکتب السلفیہ مٹیا محل دہلی۔۶

۵۔ مکتبہ مسلم بربرشاہ سرینگر کشمیر

فہرست کتاب

مقدمہ

فرض نماز کے بعد دعا کرنا متعدد احادیث صحیحہ سے ثابت ہے لیکن حدیث کے اتنے بڑے ذخائر کے اندر اس دعا میں رفع یدین کرنے کے سلسلے میں ایک بھی صحیح حدیث وارد نہیں، یہی اس بات کی واضح اور بین دلیل ہے کہ عہد نبوی ﷺ اور عہد صحابہ کرام رضی اللہ عنھم میں اس دعا کا رواج نہیں تھا، نیز ہر فرض نماز کے بعد امام ہاتھ اٹھا کر دعا کرے اور مقتدی حضرات آمین آمین کہتے جائیں، دعا کی یہ ہیئت نہ رسول ﷺ سے ثابت ہے اور نہ آپ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنھم سے، نہ بسند صحیح، اور نہ بسند ضعیف۔

اگر چہ اس سلسلے میں بہت ساری کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور متعدد علماء محققین اپنی اپنی تصانیف میں اس کی تردید کر چکے ہیں مگر پھر بھی اس دور کے بعض علماء اس بات کے قائل ہیں کہ "ہر فرض نماز کے بعد اجتماعی طور پر دعا مانگنا (مروجہ طریقہ سے) سنت ہے" ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ اسکے عدم جواز کی دنیا میں کوئی دلیل نہیں ہے، نیز اسکی تائید میں بہت سارے عقلی دلائل پیش کرتے ہیں۔

ان ہی علماء کرام میں سے ہمارے یہاں کے ایک قابل قدر عالم بھی ہیں جنہوں نے تحریری فتوی دیا ہے کہ ہر فرض نماز کے بعد امام ہاتھ اٹھا کر دعا کرے اور مقتدی آمین آمین کہے دعا کی یہ ہیئت سنت ہے۔

اگر چہ میں نے کہیں بھی ان کا نام نہیں لیا ہے مگر میرا یہ مقالہ درحقیقت ان ہی کی تردید میں ہے، میں نے ان کے ان دلائل کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے جنہیں مولانا

موصوف یا ان کے نظریہ کے حاملین حضرات پیش کرتے ہیں۔

یہ مقالہ "مروجہ اجتماعی دعا کے دلائل کا علمی جائزہ" کے نام سے دسمبر ۱۹۹۹ء، جنوری ۲۰۰۰ء، اور جنوری ۲۰۰۱ء کے جریدہ ترجمان میں تین قسطوں میں شائع ہوا تھا، جس کو قارئین حضرات نے بہت پسند کیا تھا، بعض نے اس کی فوٹو کاپیاں تقسیم کروائی جبکہ بعض حضرات نے اسے کتابی شکل میں شائع کرنے کی درخواست کی لہذا اس میں کچھ اضافہ کرکے اور آخیر میں عیدین کے بعد، دفن میت کے بعد، اختتام مجلس کے وقت، افطار کے وقت اور عقد نکاح کے وقت مروجہ طریقے سے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کے مباحث اضافہ کرکے اسے شائع کیا جارہا ہے اور اس وقت اسکا نام "بدعتی دعاؤں سے بچئے" رکھا جارہا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کے ذریعہ عوام کو کتاب وسنت کی راہ دیکھائے نیز ہمارے لیے اور اس کے جملہ معاونین کے لیے اسے نجات کا ذریعہ بنائے۔ (آمین)

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابوطاہر بن عزیز الرحمٰن السلفی
استاد جامعہ اسلامیہ سلفیہ عبداللہ پور
صاحب گنج، جھارکھنڈ، 816101

۲۰۰۹/۴/۴ء

ہاتھ اٹھا کر دعا وہیں مانگی جا سکتی ہے جہاں پر ثابت ہے

جس طرح نماز ایک عبادت ہے اسی طرح دعا بھی ایک عبادت ہے، صحیح حدیث میں ہے "الدعاء ھو العبادۃ" (ابوداود ۱/۲۰۸)

دعا ہی عبادت ہے اور عبادت میں توقیف ضروری ہے اس میں کسی قسم کی کمی و زیادتی جائز نہیں، جہاں پر جس طرح ثابت ہے۔ وہاں اسی طرح ادا کرنا واجب ہے، جیسا کہ مسجد میں داخل ہونے اور اس سے نکلنے کے وقت، وضوء کے بعد، بول و براز (ٹٹی و پیشاب) کے لیے جاتے وقت اور اس سے فراغت کے وقت سوتے وقت، جاگتے وقت، نماز کے اندر کی دعائیں جیسے اللھم باعد بینی ......وغیرہ میں اور بعض دیگر مواقع کی دعاؤں میں ہاتھ اٹھانا ثابت نہیں ہے، ٹھیک اسی طرح فرض نماز کے بعد امام کا مقتدی کی طرف رخ کر کے اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر دعا مانگنا اور مقتدی حضرات کا انکی دعا پر آمین آمین کہتے جانا، دعا کی یہ ہیئت نہ تو رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم سے، نہ بسند صحیح اور نہ بسند ضعیف، البتہ نوازل، استسقاء، قنوت، مشکلات اور بعض دیگر مواقع میں رسول اللہ ﷺ سے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا ثابت ہے، مگر ان مواقع پر بعد نماز پنجگانہ کو قیاس کرنا درست نہیں ہے، اسکی مثال یوں سمجھئے کہ صلوۃ استسقاء، صلوۃ کسوف، اور صلوۃ عیدین سنت ہے اور جماعت کے ساتھ ادا کرنا ثابت ہے کیا آپ ان نمازوں پر قیاس کرتے ہوئے فجر، ظہر، مغرب اور عشاء کی سنتوں کو جماعت کے ساتھ ادا کریں گے؟ اگر آپ جواباً کہتے

ہیں کہ نہیں! تو پھر سوال ہوتا ہے کہ کیوں؟ یہ بھی سنت وہ بھی سنت دونوں میں فرق کیا ہے؟ فرق صرف اور صرف یہی ہے کہ صلوۃ کسوف وغیرہ جماعت کے ساتھ ادا کرنا ثابت ہے اور ان سنتوں میں اس کا ثبوت نہیں ہے اور یہ سب عبادات ہیں جس طرح ثابت ہے اسی طرح ادا کرنا ضروری ہے، ٹھیک اسی طرح مروجہ دعا کو بھی سمجھ لیں۔

ہاتھ اٹھا کر دعا صرف وہیں مانگی جاسکتی ہے جہاں قرآن وحدیث سے ثابت ہو اور جہاں پر ثابت نہیں وہاں دعا میں ہاتھ نہ اٹھانا ہی سنت ہے، اسکی دلیل وہ حدیث ہے جس کو ترمذی نے بسند صحیح روایت کیا ہے: **قال حصین** : سمعت عمارة بن رويبة و بشر بن مروان يخطب، فرفع يديه في الدعاء فقال عمارة: قبح الله هاتين اليدين القصيرتين ، لقد رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم، وما يزيد على أن يقول هكذا، (جامع ترمذی باب ماجاء في كراهية رفع الايدي على المنبر یہ حدیث مسند احمد اور مسند طیالسی میں بھی ہے)

حصین کہتے ہیں: میں نے جلیل القدر صحابی عمارہؓ سے سنا اس حال میں کہ (کوفہ کا والی) بشر بن مروان خطبہ جمعہ کے دوران کی دعاؤں میں منبر پر کھڑے کھڑے اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر دعا مانگنے لگا، اس پر عمارہ صحابی نے کہا: اللہ تعالیٰ ان چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کا برا کرے، میں نے رسول اللہ ﷺ کو جمعہ کا خطبہ دیتے ہوئے دیکھا ہے، آپ ﷺ انگلی سے اشارہ کے علاوہ کچھ بھی نہیں کرتے تھے۔

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے صاحب تحفہ علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہ حدیث خطبہ جمعہ میں منبر پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کی کراہت پر دلالت کرتی ہے۔ (تحفۃ الاحوذی ۳/۴۸)

ذرا غور کیجئے! خطبہ جمعہ کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بارش کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی ہے (بخاری) پھر بھی عمارہ صحابیؓ بشر بن مروان پر صرف اس لیے

غصہ ہو گئے اور ان کے لیے بد دعا کر دی کہ خطبہ جمعہ کے دوران کی دعاؤں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہاتھ اٹھانا ثابت نہیں ہے، لھذا اس دعا میں ہاتھ نہ اٹھانا ہی سنت ہے۔

دوسری دلیل مسند طیالسی کی وہ روایت ہے جو انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

”کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یرفع یدیه فی الدعاء حتی یری بیاض ابطیه، قال شعبة: فذکرت ذلک لعلی بن زید، فقال انما ذلک فی الاستسقاء قلت : سمعته من انس فقال: سبحان الله (دعاء کے آداب واحکام طبع دوم ص۹۲ بحوالہ مسند طیالسی حدیث: ۲۰۴۷ ص۲۷۲ نیز یہ حدیث سنن نسائی میں معنی مروی ہے دیکھئے ترک رفع الیدین فی الدعاء فی الوتر)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا میں اتنا اوپر ہاتھ اٹھاتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بغل کی سفیدی نظر آنے لگتی، شعبہ کہتے ہیں: میں نے یہ بات علی بن زید کے سامنے بیان کی تو انہوں نے فرمایا کہ ایسا آپ صلی اللہ علیہ وسلم استسقاء میں کرتے تھے، شعبہ کہتے ہیں: میں نے عرض کیا کہ آپ نے یہ بات انس رضی اللہ عنہ سے سنی ہے؟ اس پر علی بن زید نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے سبحان اللہ کہا یعنی میں انس رضی اللہ عنہ سے بغیر سنے کیسے کہہ سکتا ہوں؟ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ ”فتح الباری“ (۱۱/۱۱۱-۱۱۲) کے اندر فرماتے ہیں: امام شریح رحمہ اللہ نے ایک آدمی کو ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہوئے دیکھ کر فرمایا: ان ہاتھوں سے کیا پکڑنا چاہتے ہو! تمہاری ماں نہ رہے، امام مالکؒ کا قول ہے کہ دعا میں ہاتھ اٹھانا فقہاء کا طریقہ نہیں تھا، نیز امام مالک نے ”معرفہ“ میں لکھا ہے کہ دعا میں ہاتھ اٹھانا استسقاء کے ساتھ خاص ہے۔

انس رضی اللہ عنہ کی مذکورہ روایت پر غور کیجئے! دعا میں ہاتھ اٹھانے کو شعبہ نے عموم پر محمول کیا تو علی بن زید نے تعجب کا اظہار کیا، امام شریح رحمہ اللہ کو دیکھئے ایک آدمی کو بے موقع ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہوئے دیکھا تو اس پر غصہ ہو گئے، اسی طرح

امام مالکؒ کے دونوں قول پر غور کیجئے، انہوں نے بھی علی بن زید کی طرح دعا میں ہاتھ اٹھانے کو مخصوص مانا ہے۔

بیان مذکور سے اتنا تو ضرور واضح ہو جاتا ہے کہ جہاں پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا ثابت ہے وہاں ہاتھ اٹھانا سنت ہے اور جہاں ثابت نہیں وہاں پر دعا میں ہاتھ نہ اٹھانا سنت ہے، کیوں کہ جس کام کو نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا اور نہ کرنے کا حکم دیا اور جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریر سے بھی ثابت نہ ہو ایسے کاموں کو چھوڑنا ہی سنت ہے، جیسا کہ فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ''ذرونی ماتر کتکم'' سے پتہ چلتا ہے، تم لوگ مجھے چھوڑے رکھو جب تک میں تم لوگوں کو چھوڑے رکھتا ہوں، یعنی جب تک میں تم کو نہ بتاؤں یا میں کوئی عمل کر کے نہ دیکھا دوں تب تک تم لوگ بھی نہ کرو۔

ہماری ایک دلیل صحیح بخاری (۸۸/۱) کی حدیث ''صلوا کما رأیتمونی اصلی'' بھی ہے یعنی تم نماز اسی طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو، اور فرض نماز کے بعد مروجہ دعا مانگتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی بھی صحابی نے نہیں دیکھا، اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم دیا، ورنہ حدیث کی کتابوں میں سے کسی بھی کتاب میں بسند صحیح اس چیز کا ضرور ذکر ہوتا، کیونکہ نماز کے ہر ہر جزء کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بیان کر دیا ہے، اگر چھوڑ دیا ہے تو صرف اور صرف مروجہ دعا کو؟ کیا صحابہ کرامؓ کو اس سے کچھ دشمنی تھی؟ (نعوذ باللہ من ذلک) نہیں! ہرگز نہیں!

دوسری طرف بہت سارے مواقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا ثابت ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا میں ہاتھ اٹھانے کے لیے مخصوص ہیئت و مخصوص مقامات ہیں ان مقامات سے تجاوز کرنا جائز نہیں۔

کیونکہ دعا عبادت ہے اور عبادت میں حد سے تجاوز کرنا جائز نہیں ہے مثلاً ظہر کی فرض نماز چار رکعات کے بجائے چھ رکعات ادا کرنا ہرگز جائز نہ ہوگا، اسی طرح صلوۃ

رغائب یعنی رجب کے پہلے جمعہ کی شب میں نفل پڑھنا اور صلوۃ برات یعنی پندرہویں شعبان کی رات میں نفل پڑھنا، زبان سے نماز یا وضوء کی نیت کرنا، عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم منانا اور اسکی محفلوں میں قیام کرنا بدعت ہے۔

ذرا سوچئے! یہ سب کام بدعت کیوں ہوئے اسی لئے نا! کہ یہ سب عبادات ہیں اور اس طرح سے ادا کرنا ثابت نہیں ہیں۔ ٹھیک اسی طرح مروجہ دعا کی بھی حالت ہے جس ہیئت کے ساتھ اس کا رواج پڑ چکا ہے اس ہیئت کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا مانگنا ثابت نہیں ہے۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ترک فعل میں بھی واجب ہے

جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع فعل میں واجب ہے اسی طرح ترک فعل میں بھی واجب ہے ارشاد ربانی ہے: قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی'' (آل عمران۔۳۱)

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: اطیعوا اللہ والرسول (آل عمران۔۳۲) اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو۔ نیز ارشاد ہوتا ہے: لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (احزاب۔۲۱) تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہی بہترین روش ہے نیز ارشاد ہوتا ہے: وما اتاکم الرسول فخذوہ ومانھاکم عنہ فانتھوا (حشر۔۷) اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم تم کو جو حکم دے اسے مان لو اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز رہو، مذکورہ آیات

کریمہ سے یہی مستفاد ہوتا ہے کہ جس کام کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا یا کرنے کا حکم دیا، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کسی صحابی نے کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر سکوت اختیار کیا، اس کام کا کرنا جس طرح سنت ہے، اسی طرح جس کام کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا یا کرنے کا حکم نہیں دیا، اس کا نہ کرنا ہی سنت ہے اور یہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہے۔ چنانچہ استاد محترم جناب عزیز الرحمٰن سلفی حفظہ اللہ فرماتے ہیں۔

جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کیے ہوئے اعمال، اقوال اور تقریرات کی اقتداء سنت ہے، اسی طرح ان کاموں کا نہ کرنا بھی سنت ہے جن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، حضرت عثمان بن مظعون کی ''تبتل'' والی حدیث نیز عبداللہ بن عمرو بن العاص کی رات بھر نماز پڑھنے اور دن بھر روزہ رکھنے والی حدیث شاہد ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی ترک فعل کو حجت بنا کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین عظام نے اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو بدعتی اور ان کے فعل کو بدعت قرار دیا ہے، اسکی چند مثالیں مختصراً ملاحظہ ہوں۔

(۱) عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے دعا میں سینے سے اوپر ہاتھ اٹھانے کو بدعت قرار دیا ہے اور دلیل یہ دی ''ما زاد رسول الله صلى الله عليه وسلم على هذا يعني الصدر'' (مسند احمد) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سینہ سے اوپر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔

(۲) عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے چاشت کی مسنون نماز میں جماعت کے ساتھ ادائیگی کے التزام و اجتماع کو بدعت قرار دیا ہے۔

(۳) انہوں نے ہی عصر کی نماز میں دعا قنوت پڑھنے کو بدعت قرار دیا ہے، اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ثبوت نہیں تھا (ترمذی)۔

(۴) عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ دعا میں سجع اور قافیہ آرائی سے منع کرتے تھے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایسا نہیں کرتے تھے۔

(۵) ایک شخص عصر کی نماز کے بعد اکثر دو رکعت نماز پڑھا کرتا تھا، اس نے اپنے اس عمل کے بارے میں سعید بن المسیب رحمہ اللہ سے کہا "ایعذبنی الله علی الصلوٰۃ" کیا اللہ تعالیٰ اس نماز کے سبب مجھے عذاب دے گا؟ سعید بن المسیب رحمۃ اللہ علیہ کا جواب ملاحظہ ہو' لا، ولکن یعذبک بخلاف السنۃ (مسند دارمی) نہیں، نفل نماز پر تو اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب نہیں دیگا، البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی مخالفت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ تجھے ضرور عذاب دیگا (بقیہ مثالیں دعاء کے آداب واحکام طبع دوم ص ۱۳۰۔۱۳۲ کے اندر دیکھی جا سکتی ہیں)

اس طرح کی مثالوں کو پیش نظر رکھ کر وہ حضرات غور کریں جو مروجہ دعا کو مستحب یا سنت سمجھتے ہیں اور اسکی تائید میں بہت سارے عقلی دلائل پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے مانگنا تو کوئی برا کام نہیں، ذرا سوچئے کیا نماز پڑھنا کوئی برا کام ہے؟ پھر صحابہ کرام اور تابعین عظام نے مذکورہ فعل کو بدعت اور اسکے کرنے والے کو بدعتی کہتے ہوئے عذاب کی دھمکی کیوں دی؟

یاد رہے چھ قسم کے لوگوں پر اللہ تعالیٰ، تمام انبیاء اور فرشتوں کی لعنت ہے ان میں سے ایک قسم کے لوگ وہ ہیں جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑنے والے ہیں (مشکوٰۃ المصابیح مع مرعاۃ المفاتیح، باب الایمان بالقدر الفصل الثانی بسند صحیح) نیز حبر امت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: من خالف السنۃ، کفر، جس نے سنت کی مخالفت کی اس نے کفر کی (تحفۃ المودود باحکام المولود ص: ۱۰۳)

خیر القرون میں مروجہ اجتماعی دعا کا کوئی وجود نہیں

کتب حدیث یعنی صحاح، سنن، مسانید، معاجم، اجزاء اور مصنفات وغیرہ اور کتب فقہ جیسے مدونہ، منیۃ المصلی، کبری، المغنی اور المحلی وغیرہ پر نظر ڈالئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ائمہ اربعہ یعنی امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ، نیز محدثین کرام جیسے امام بخاری، امام مسلم، امام ابن حبان، امام ابن خزیمہ، امام حاکم، امام ابوداود، امام نسائی، امام ترمذی، امام دارمی، امام بیہقی، امام طبرانی، امام بزار، امام ابویعلی، امام ابن ابی شیبہ، امام عبدالرزاق اور امام ابوداود طیالسی وغیرہ رحمہم اللہ میں سے کسی نے بھی یہ بیان نہیں کیا ہے کہ کسی بھی وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کی ہے اور مقتدی حضرات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا پر آمین آمین کہتے گئے ہیں، حالانکہ محدثین کرام نے نماز کے کسی جزوی مسئلہ کو بھی نہیں چھوڑا ہے۔

ہاں! انہوں نے بے شمار ایسی احادیث وآثار ضرور بیان کئے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مروجہ دعاء رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں، اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں نہیں ہوتی تھی،

وہ احادیث اور آثار جن سے پتہ چلتا ہے کہ خیر القرون میں مروجہ دعا کا وجود نہیں تھا

(۱) عن ام سلمه قالت: كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا سلم قام النساء حين يقضى تسليمه ومكث يسيرا قبل ان يقوم

(صحیح بخاری ۱/۱۱۶)

وفی روایة لابی داؤد: کانوا یرون ان ذلک کیما ینفذ النساء قبل الرجال (ابوداؤد کتاب الصلوۃ، باب انصراف النساء قبل الرجال)

ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے: وہ فرماتی ہیں کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سلام پھیرتے تھے تو جیسے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام پھیرنا ہوتا فوراً عورتیں کھڑی ہو جایا کرتی تھیں (اور مسجد سے نکل جایا کرتی تھیں) اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہونے سے قبل تھوڑی دیر اپنی جگہ پر بیٹھے رہتے تھے، ابوداود کی ایک روایت میں ہے کہ صحابہ کرام کا بیان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کچھ دیر رکنا صرف اس غرض سے تھا کہ مردوں سے پہلے عورتیں مسجد سے نکل کر اپنے اپنے گھروں کو پہنچ جائیں تاکہ راستہ میں مرد و زن کا اختلاط نہ ہو۔

وجہ استدلال: اگر اس دعا کا رواج رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوتا تو ضرور آپ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کو ایک وقت کی دعا کے لیے بھی روک لیتے لیکن کسی بھی حدیث میں یہ وارد نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بھی دن یا کسی بھی وقت عورتوں کو دعا کے لیے روکا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی ؒ "فتح الباری" (۲/۲۲۸-۲۲۹) میں فرماتے ہیں کہ اگر مصلی صرف مرد ہوں اور عورتیں مسجد میں نہ آتی ہوں تو اتنی دیر بھی بیٹھنا مستحب نہیں ہے۔

(۲) عن عائشة قالت: انه صلی الله علیه وسلم کان اذا سلم لم یقعد الا مقدار ما یقول: اللهم انت السلام ومنک السلام تبارکت یا ذا الجلال والاکرام (مسلم ۱/۲۱۸)

عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب سلام پھیرتے تھے تو

"اللھم انت السلام ومنک السلام تبارکت یاذا الجلال والاکرام"

کہنے کی مقدار ہی بیٹھتے تھے۔

وجہ استدلال: عائشہ رضی اللہ عنہا کے قول "مقدار مایقول" پر غور کیجئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سلام پھیرنے کے بعد صرف ان کلمات کو کہنے کے بقدر ہی بیٹھتے تھے، پھر اٹھ کر چل دیتے تھے، سوال یہ ہے کہ مروجہ دعا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کب مانگتے تھے؟

(۳) عن عقبة بن الحارث قال: صليت وراء النبی صلی الله علیه وسلم بالمدینة العصر، فسلم ثم قام مسرعا فتخطی رقاب الناس الی بعض حجر نسائه (بخاری ۱/۱۱۷)

عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے مدینہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے عصر کی نماز پڑھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا، پھر بہت ہی جلد اٹھ کھڑے ہوئے اور لوگوں کی گردنیں پھاندتے ہوئے اپنی بعض بیوی کے حجرہ میں داخل ہو گئے۔

وجہ استدلال: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس چلے جانے کا سبب کچھ بھی ہو مگر اس سے اتنا تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھا کر دعا نہیں کی یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ مروجہ دعا نہیں ہوتی تھی، اگر آپ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جانا ضرورت کے تحت کبھی کبھار تھا تو اس کا جواب حدیث نمبر چار میں تلاش کریں۔

(۴) عن ابی هریرة قال: صلی بنا رسول الله صلی الله علیه وسلم احدی صلوتی العشی قال ابن سیرین: سماها ابو هریرة ولکن نسیت انا، قال: فصلی بنا رکعتین ثم سلم فقام الی خشبة معروضة فی المسجد فاتکا علیها، الحدیث (صحیح بخاری باب تشبیك

الاصابع فی المسجد وغیرہ ۱/٦٩)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو شام کی دو نمازوں میں سے کوئی ایک نماز پڑھائی (یعنی ظہر یا عصر کی نماز جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت میں اس کی صراحت موجود ہے) ابن سیرین کہتے ہیں کہ میرے استاد ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے تو اس کا نام بتایا تھا لیکن میں بھول گیا، ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار رکعات کے بجائے دو ہی رکعات میں سلام پھیر دیا، اور مسجد میں رکھی ہوئی ایک لکڑی کی طرف جا کر کھڑے ہو گئے اور اس پر ٹیک لگا لی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سلام پھیرتے ہی ہاتھ اٹھا کر دعا مانگے بغیر اٹھکر چل دیئے، ہاں اس میں ایک بات اور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دن کوئی ضروری کام بھی نہیں تھا، جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سلام کے بعد کبھی کبھار کسی ضرورت کے تحت گئے ہوں، یہ خیال بالکل غلط ہے۔

کیونکہ اگر ایسی بات ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس طرح لکڑی پر ٹیک لگا کر کھڑے نہ ہوتے، بلکہ اس ضرورت کی طرف چل دیتے صحیح بات تو یہ ہے کہ اکثر آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھکر چل دیتے تھے لیکن کبھی کبھار کسی ضرورت کے تحت مصلی پر بیٹھے رہتے مثلاً فجر کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے خوابوں کی تعبیر بیان کرنا یا کہیں لشکر بھیجنا وغیرہ بعض روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی نماز سے لیکر طلوع آفتاب تک مصلی پر بیٹھے رہتے تھے۔

(۵) عن انس قال : صليت وراء النبی صلی الله عليه وسلم فكان ساعة يسلم يقوم، ثم صليت وراء ابی بكر فكان اذا سلم وثب فكانما يقوم عن رضفة (نيل الاوطار ۲/۳۵۳)

خادم رسول صلی اللہ علیہ وسلم انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم سلام پھیرتے ہی فوراً کھڑے ہو جاتے تھے، پھر میں نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی، پس جب ہی وہ سلام پھیرتے تو اتنی جلد کھڑے ہو جاتے گویا وہ سخت گرم پتھر سے کھڑے ہو رہے ہیں۔

دیکھئے دس سال تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کرنے والے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے والے صحابی انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، پھر آپ ﷺ کے بعد خلیفہ اول ابوبکر رضی اللہ عنہ سلام پھیرتے ہی کھڑے ہو جاتے تھے۔

سوال یہ ہے کہ مروجہ دعا کب مانگتے تھے؟

(٦) اخرج ابو داؤد بسند صحیح عن جندب قال: جاء اعرابی، فاناخ راحلته ثم عقلها ثم دخل المسجد فصلی خلف رسول الله صلی الله علیه وسلم فلما سلم اتی راحلته ثم رکب (ابو داؤد باب من لیست له غیبة ۲/ ۰ ٦٧)

جندب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ایک دیہاتی آدمی آیا اور اپنی سواری کو بیٹھایا، پھر اس کو باندھ دیا اور مسجد میں داخل ہوا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھی، جب سلام پھیرا تو وہ اپنی سواری کے پاس آیا پھر اس پر سوار ہو گیا۔

دیکھئے وہ دیہاتی آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سلام پھیرنے کے بعد ہی اٹھ کر اپنی سواری پر جا بیٹھا لیکن کیا بات ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو یہ نہیں کہا کہ "اے شخص ابھی رکو! پہلے ہاتھ اٹھا کر دعا تو کر لو"

(٧) عن عبدالله قال: اذا سلم الامام فقم واصنع ما شئت، یقول: لا تنتظر قیامه ولا تحوله من مجلسه (رواه ابن ابی شیبة، دعاء کے آداب

واحکام طبع دوم ص: ۸۸۔۸۹)
عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ امام جب سلام پھیر دے تو کھڑے ہو جاؤ اور جو چاہو سو کرو، امام کے کھڑے ہونے اور اس کے اپنی جگہ سے ہٹ جانے کا انتظار نہ کرو

دیکھیے ایک جلیل القدر صحابی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ صاف صاف فرماتے ہیں کہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد کھڑے ہو جاؤ، پھر آپ مروجہ دعا کے لیے مجبور کرنے والے کون ہوتے ہیں؟

(۸) قال عمر: جلوس الامام بعد التسليم بدعة (ابن ابی شیبة، دعاء کے آداب واحکام طبع دوم ص: ۹۰) خلیفہ ثانی عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سلام پھیرنے کے بعد امام کا بیٹھے رہنا بدعت ہے۔

(۹) قال ابو رزین: صليت خلف علي، فسلم عن يمينه و عن يساره ثم وثب كما هو (ابن ابی شیبة دعاء کے آداب واحکام ص: ۸۹)
ابو رزین بیان کرتے ہیں کہ میں نے خلیفہ رابع علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے نماز پڑھی، آپ دائیں، بائیں سلام پھیرنے کے بعد فوراً کھڑے ہو گئے۔

(۱۰) كان ابو عبيدة بن الجراح اذا سلم كانه على الرضفة حتى يقوم (دعاء کے آداب واحکام ص: ۹۰)
ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ سلام کے بعد فوراً اٹھ کھڑے ہوتے، گویا کہ آپ گرم پتھر سے کھڑے ہو رہے ہیں۔

(۱۱) قال سائب بن يزيد: صليت معه (مع معاوية) الجمعة في المقصوره، فلما سلم قمت في مقامي، فصليت فلما دخل ارسل الي فقال: لا تعد لما فعلت اذا صليت الجمعة فلا تصلها بصلاة حتى

تتکلم او تخرج (صحیح مسلم ۱/۲۸۸)
سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھی، اور امام کے سلام پھیرنے کے بعد ہی میں نے جہاں فرض نماز ادا کی تھی وہیں پر نفل ادا کرنے لگا، یہ دیکھ کر معاویہ رضی اللہ عنہ نے مجھے بلوا کر کہا آج تم نے جو عمل کیا ایسا کبھی نہ کرنا، جب تم جمعہ کی فرض نماز ادا کرلو تو اسی جگہ پر نفل نہ پڑھو، بلکہ کسی سے بات کرلو یا تو اس جگہ سے ہٹ جاؤ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نماز کو دوسری نماز کے ساتھ ملانے سے منع کیا ہے، یہاں تک کہ ہم کسی سے بات کرلیں یا اس جگہ سے ہٹ جائیں۔

وجہ استدلال: اس سے معلوم ہوا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بھی یہ مروجہ دعا نہیں ہوتی تھی، کیونکہ انہوں نے سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے کہا "جب تم جمعہ کی فرض نماز ادا کرلو تو اسی جگہ پر نفل نہ پڑھو بلکہ کسی سے بات کرلو یا تو اس جگہ سے ہٹ جاؤ" اور انہوں نے سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے یہ نہیں کہا کہ "تم نے ہاتھ اٹھا کر دعا کیوں نہیں کی؟ یا تم نے اجتماعی دعا میں شرکت کیوں نہیں کی؟" اگر اس دعا کا رواج اس زمانہ میں ہوتا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا ثبوت ہوتا تو معاویہ رضی اللہ عنہ ان کو کبھی نہ چھوڑتے کیونکہ وہ امیر وقت تھے، بلکہ ان کو یہ کہہ کر ضرور تنبیہ کر دیتے کہ ہم سب اجتماعی یا انفرادی دعا کے لیے بیٹھے تھے اور تم کو کیا اتنی جلد بازی تھی کہ تم اٹھ کر سنت ادا کرنے لگے؟

(۱۲) عن عمران بن حصین ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلی العصر فسلم فی ثلاث رکعات، ثم دخل منزلہ و فی روایۃ فدخل الحجرۃ، فقام الیہ رجل یقال لہ الخرباق الخ
عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی

نماز پڑھائی جس کی تین ہی رکعات میں سلام پھیر دیا، پھر اپنے گھر میں داخل ہو گئے (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد دلانے کے لیے کہ آپ نے تین رکعات نماز پڑھائی ہے) ایک آدمی کھڑا ہوا جس کا نام خرباق تھا۔

دیکھئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سلام پھیرتے ہی اٹھ کر چلے گئے اور اپنے حجرے میں داخل ہو گئے۔ ذرا سوچئے اگر اس دعا کا رواج ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کئے بغیر کبھی نہ جاتے۔

(۱۳)عن ابی هریره قال : قام رسول الله صلى الله عليه وسلم الى الصلوة وقمنا معه" فقال اعرابی وهو فی الصلوة: اللهم ارحمنی ومحمداً ولا ترحم معنا احداً ، فلما سلم رسول الله صلى الله عليه وسلم قال للاعرابی: لقد تحجرت واسعاً (ابو داؤد، باب الدعا فی الصلوۃ، وسنن النسائی، الکلام فی الصلوۃ)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے کھڑے ہوئے ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کھڑے ہو گئے، ایک دیہاتی آدمی نے نماز کے اندر ہی یہ کہہ دیا "اے اللہ تو میرے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر رحم کر اور ہمارے ساتھ کسی پر رحم نہ کر" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سلام پھیرا تو اس دیہاتی سے فرمایا: تم نے "**لا ترحم معنا احداً**" کہہ کر اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کو تنگ کر دیا۔

<u>وجہ استدلال</u>: اس دیہاتی نے نماز کے اندر ہی یہ دعا کی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تعلیم دی کہ دیکھو جب دعا مانگو تو اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کو تنگ نہ کرو اور "لا ترحم معنا احداً" نہ کہو بلکہ اللہ کی رحمت کو عام رہنے دو، لیکن قابل غور بات تو یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ نہیں کہا کہ "تم کو نماز کے اندر اس طرح دعا

نہیں کرنی چاہیئے ، بلکہ سلام کے بعد سب کے لیے عام کر کے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنی چاہیئے یا یہ کہ میں جب ہاتھ اٹھاؤں گا تب تم کو آمین آمین کہنا چاہیئے، آخر کیوں؟

یہ اوران جیسی حدیثوں کو پیش نظر رکھ کر وہ حضرات غور وفکر کریں جو کہتے ہیں کہ عدم جواز کی دنیا میں کوئی دلیل نہیں ہے، کیا مذکورہ تمام حدیثیں عدم وقوع کی دلیل نہیں ہیں؟ اور عدم وقوع ہی عدم جواز کی دلیل ہے۔

فتاوٰی ثنائیہ، نذیریہ اور تحفۃ الاحوذی کا حوالہ

جو لوگ فرض نماز کے بعد اجتماعی طور پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کے قائل ہیں، ان لوگوں سے اکثر یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ ''فتاوی نذیریہ'' وغیرہ میں اس کو جائز یا مستحب قرار دیا گیا ہے۔

میرے خیال میں یہ حضرات ان کتابوں کو غور سے پڑھتے ہی نہیں ہیں کیونکہ ''فتاوی نذیریہ'' میں جو تین حدیثیں ہیں ان میں سے دو حدیثیں تو حد درجہ کی ضعیف ہیں، اور ایک حدیث جسے مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے اس کے اندر وہ لفظ ہی نہیں ہے جس سے استدلال کیا جاتا ہے یعنی ''رفع یدیہ ودعا'' (ہاتھ اٹھایا اور دعا کی) کا لفظ اصل کتاب میں نہیں ہے، تفصیل آگے آرہی ہے۔ انشاء اللہ

اور ''تحفۃ الاحوذی'' میں ''فتاوی نذیریہ'' کی تینوں حدیثوں کے علاوہ دو حدیث اور ہیں جن سے نفل نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا ثابت ہوتا ہے ان میں سے الصلوۃ مثنیٰ مثنیٰ ..... والی حدیث تو ضعیف ہے اور ابن زبیرؓ کی حدیث کے بارے میں علامہ ہیثمی نے ''رجالہ ثقات'' فرمایا ہے مگر اصول حدیث کا یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ راوی کے ثقہ ہونے سے حدیث کا صحیح ہونا ضروری نہیں، بلکہ متن شاذ و معلل ہوسکتا ہے، اس کی بہت ساری مثالیں اصول حدیث کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہیں، نیز حدیث کی

تصحیح کے سلسلے میں علامہ ہیثمیؒ کو علماء محققین نے متساہل مانا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے جیسا کہ آگے انشاء اللہ اس کی تفصیل آرہی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ عبداللہ بن زبیرؓ کی یہ حدیث، صحیح احادیث کے خلاف بھی ہے، کیونکہ اس میں نماز کے اندر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے سے منع کیا گیا ہے، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے اندر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا متعدد احادیث صحیحہ سے ثابت ہے مثلاً قنوت وغیرہ میں نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ابوبکرؓ نے نماز کے اندر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی ہے (صحیح بخاری ۹۴/۱)

پھر ان ضعیف احادیث سے تو صرف انفرادی طور پر فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا ثابت ہوتا ہے، باقی رہی آمین آمین کی صورت تو یہ بلا شبہ ایجاد کردہ ہے کسی بھی حدیث میں نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ صاحب ''تحفۃ الاحوذی'' نے انفرادی طور پر فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کو صرف جائز قرار دیا ہے، انہوں نے نہ تو مستحب کہا ہے اور نہ سنت، چنانچہ آں رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''القول الراجح عندی ان رفع الیدین فی الدعاء بعد الصلوۃ جائز، لو فعله احد لا باس علیه انشاء الله تعالی ''(تحفۃ الاحوذی ۲/۲۰۲، باب ما یقول اذا سلم)

میرے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ نماز کے بعد دعا میں دونوں ہاتھوں کو اٹھانا جائز ہے، اگر کوئی شخص کرے گا تو اس پر کچھ حرج نہ ہوگا انشاء اللہ تعالیٰ۔

پھر اسی کے بعد آں رحمہ اللہ نے ایک تنبیہ قائم کر کے حنفیوں کی فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کی تردید بھی کر دی ہے، جس سے مروجہ دعا کی بھی تردید ہو جاتی ہے، چنانچہ موصوف فرماتے ہیں:

''جان لو! موجودہ زمانہ میں حنفیہ ہر فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے میں مواظبت کرتے ہیں، جیسے واجب کام کے لیے مواظبت کی جاتی ہے، گویا وہ لوگ اس کو واجب سمجھتے ہیں، اسی لیے یہ لوگ اس شخص پر غصہ ہوتے ہیں، جو فرض نماز سے سلام پھیرنے کے بعد: اللھم انت السلام و منک السلام تبارکت یا ذا الجلال والاکرام'' پڑھکر اٹھ جاتا ہے اور ہاتھ اٹھا کر دعا نہیں مانگتا ہے، احناف کا یہ عمل (قرآن وحدیث کے خلاف تو ہے ہی لیکن) امام ابوحنیفہؒ کے قول کے بھی خلاف ہے، اوران کی معتبر کتابوں کے بھی خلاف ہے۔

اس کے بعد موصوف نے حنفی مذھب کی معتبر کتابوں سے ثبوت دیا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ اور حنفی مذھب کے معتبر علماء بھی اس مروجہ دعا کے قائل نہیں تھے۔ (دیکھئے تحفۃ الاحوذی باب مایقول اذا سلم)

مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسریؒ نے یہ ضرور کہا کہ'' دعا کے ساتھ آمین کہنا چونکہ شرعاً ثابت ہے، اس لیے اس دعا میں مقتدی بھی شریک ہوکر آمین کہہ سکتے ہیں، کیونکہ اصولاً ثابت شدہ امر عام رکھنا چاہئے''

آن رحمہ اللہ کا یہ استدلال کہاں تک درست ہے، آیئے شیخ الاسلام مولانا عبیداللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریر میں دیکھتے ہیں چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ نے فرض نماز کے بعد امام کی دعا میں مقتدیوں کے شریک ہوکر آمین کہنے پر ابن ابی حاتم کی محولہ روایت سے جو تفسیر ابن کثیر میں مذکور ہے استدلال نہیں کیا ہے، بلکہ ان کے استدلال کی بنیاد صرف اس قدر ہے کہ'' دعا کے ساتھ آمین کہنا چونکہ شرعاً ثابت ہے اور مقتدی امام کی دعا میں شریک ہو جاتے ہیں، اس لیے اس اجتماعی دعا میں وہ آمین کہہ سکتے ہیں، کیونکہ اصولاً ثابت شدہ امر عام رکھنا چاہئے''۔

مولانا عبید اللہ رحمانی رحمہ اللہ آگے فرماتے ہیں کہ: لیکن ہمارے نزدیک یہ استدلال مخدوش ہے جیسا کہ حبیب بن مسلمہ کی حدیث سے استدلال کے جواب میں گذر چکا کہ یہ عموم اس خاص صورت کے علاوہ کے لیے ہے (ماہنامہ محدث بنارس جون ۱۹۸۲ء ص: ۲۲)

انتباہ

کیا آپ کا خیال یہی ہے کہ کسی محدث کا کوئی مسئلہ بیان کر دینا ہی اس مسئلہ کی صحت وقبولیت کی دلیل ہے؟ ہرگز نہیں! اگر آپ اسی فریب میں پڑے ہیں تو اولاً اپنی عقل کو صیقل کر لیجئے اور غور کریں "الحق یدور مع الدلیل لا مع الادعاء او الرجال" حق دلیل کے ساتھ چکر لگاتا ہے نہ کہ دعویٰ یا رجال کے ساتھ اور اللہ تعالی کے مندرجہ ذیل فرمان پر غور کریں:

"اطیعوا اللہ والرسول" اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو
نیز ارشاد ہوتا ہے "لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہی تمہارے لیے بہترین طریقہ ہے، نیز ارشاد ہوتا ہے "وما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا" اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو جو کچھ حکم دے اسے مان لو اور جس چیز سے منع کرے اس سے باز رہو، نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان پر غور کریں:

کفی بالمرء کذباً ان یحدث بکل ما سمع (مقدمہ مسلم ۱/۸)
آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو بغیر تحقیق وتفتیش کے بیان کر دے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہی لائق اتباع ہے،

نہ کہ کوئی فقیہ یا محدث، اسی لئے جب کوئی مسئلہ درپیش ہو تو اولاً اس کے دلائل پر غور کیا جائے اگر وہ درست ہیں تو اسے قبول کر لیا جائے ورنہ نہیں، اسی کا نام عمل بالحدیث ہے۔

مروجہ دعا کے دلائل اور ان کا جائزہ

جو لوگ فرض نماز کے بعد اجتماعی یا انفرادی طور پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کے قائل ہیں، وہ لوگ مندرجہ ذیل احادیث کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں:

(۱) جامع ترمذی ''ابواب الدعاء'' میں ہے ''قیل یا رسول اللہ، ای الدعاء اسمع ؟ قال : جوف اللیل الآخر و دبر الصلوٰت المکتوبات''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کون سی دعا زیادہ قبول ہوتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آخری رات کے اندر اور صلوٰۃ فرائض کے بعد۔

اولاً: یہ حدیث متکلم فیہ ہے، امام ترمذیؒ اور علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہما اللہ نے اسکو حسن قرار دیا ہے، لیکن اس کی سند میں ایک راوی ''ابن جریج'' ہیں جو مدلس ہیں، اور یہاں عنعنہ کے ساتھ روایت کرتے ہیں، اور مدلس راوی جب عنعنہ کے ساتھ روایت کرے تو اسکی حدیث ضعیف ہوتی ہے (تیسیر مصطلح الحدیث ص:۸۴)

البتہ صحیحین کے اندر مدلسین کی جتنی روایات ہیں، دوسری سند سے سماع یا تحدیث کی صراحت موجود ہے۔

ابن جریج ہی کے عنعنہ کو بنیاد بناتے ہوئے علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ ''ابکار المنن فی تنقید آثار السنن'' ص:۲۹۶ کے اندر لکھتے ہیں: فکیف یکون ھذا الحدیث حسناً؟ یہ حدیث کیسے ''حسن'' ہوسکتی ہے؟ یعنی یہ حدیث ضعیف ہے۔

اور صاحب "مرعاۃ المفاتیح" علامہ عبید اللہ مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ امام ترمذی کی تحسین نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس کے رواۃ ثقہ ہیں مگر ابن جریج مدلس ہیں اور انہوں نے اس حدیث کو عن عبد الرحمٰن بن سابط عن ابی امامۃ یعنی عنعنہ کے ساتھ روایت کیا ہے اور مدلس راوی اگر عنعنہ کے ساتھ روایت کرے تو اسکی حدیث ضعیف ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس حدیث کو عبد الرحمٰن بن سابط نے ابوامامۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، لیکن ابوامامہ سے ان کے سماع پر کلام ہے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ عبد الرحمٰن تابعی ہیں جو بہت ارسال کرتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ کسی صحابی سے ان کا سماع ثابت نہیں ہے اور بعض کہتے ہیں کہ معاذ، عمر، عباس بن ابی ربیعہ، سعد بن ابی وقاص، عباس بن عبد المطلب اور ابوثعلبہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو نہیں پایا ہے، اور امام ابن معین سے سوال کیا گیا کہ کیا عبد الرحمٰن نے سعد رضی اللہ عنہ سے حدیث سنی ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ نہیں، پھر سوال کیا گیا کہ انہوں نے ابوامامہؓ اور جابرؓ سے سنا ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ نہیں، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں عبد الرحمٰن بن سابط نے ابوامامہؓ اور جابرؓ کا زمانہ پایا ہے (مرعاۃ المفاتیح ۳/۳۲۶)

اور اس حدیث کو انہوں نے ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ حدیث منقطع ہے، لہٰذا محدث کبیر علامہ عبید اللہ مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق بھی یہ حدیث ضعیف ہے۔

ثانیاً: اس حدیث سے تو صرف فرض نماز کے بعد دعا کی قبولیت کا ثبوت ملتا ہے، اس میں آپ کو یہ بات کہاں سے مل گئی کہ ہاتھ اٹھا کر ہی مانگو تب قبول ہوگی ورنہ نہیں؟ میرے بھائی! دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا شرط نہیں ہے، بلا ہاتھ اٹھائے بھی دعا قبول ہوتی ہے، جیسا کہ بہت سے مقامات میں آپ بھی بغیر ہاتھ اٹھائے دعا کرتے

ہیں، کما مر۔

(۲) عمل الیوم واللیلة لابن السنی میں انسؓ سے روایت ہے: قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: مامن عبد بسط کفیه فی دبر کل صلوٰة ثم یقول: اللھم الھی واله ابراھیم واسحاق ویعقوب واله جبرئیل ومیکائیل واسرافیل، اسالک ان تستجیب دعوتی فانی مضطر وتعصمنی فی دینی فانی مبتلی وتنالنی برحمتک فانی مذنب، وتنفی عنی الفقر فانی مسکین الا کان حقاً علی اللہ عزوجل ان لا یردیدیه خائبتین.

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بندہ اپنی دونوں ہتھیلیوں کو ہر نماز کے بعد پھیلا کر یہ دعاء مانگے گا: اللھم الھی الخ تو اللہ تعالی پر حق ہے کہ اس کے ہاتھوں کو خالی نہیں پھیرے گا۔

یہ حدیث تحفة الاحوذی ،فتاوی نذیریہ، صلوۃ الرسول اور بعض دیگر کتابوں میں ہے، اس کے بارے میں صاحب "کنز العمال" فرماتے ہیں: اس حدیث کو ابن السنی ابوالشیخ، دیلمی اور ابن النجاری نے انسؓ سے روایت کیا ہے، لیکن یہ حدیث واہی ہے (دعا کے آداب واحکام طبع دوم ص:۹۹)

اس حدیث کی سند میں تین ضعیف راوی ہیں (۱) اسحاق بن خالد بن یزید البالسی۔ (۲) عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن القرشی (۳) خصیف نیز خصیف روایت کرتے ہیں انسؓ سے لیکن ان کا انس رضی اللہ عنہ سے سماع ثابت نہیں ہے، تفصیل آگے "کیا ہر ضعیف حدیث تعدد طرق کی بناء پر حسن ہو جاتی ہے؟" کے زیر عنوان آرہی ہے انشاء اللہ۔

واضح رہے کہ ضعیف احادیث کے مختلف درجات ہوتے ہیں مثلاً (۱) ضعیف (۲) ضعیف جداً (۳) اس کے بعد واہی کا درجہ آتا ہے، اب اس واہی حدیث پر کیسے

اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

(۳) سنن ابی داؤد اور جامع ترمذی میں ہے: **لا یؤم قوماً فیخص نفسه بالدعاء دونهم، فان فعل فقد خانهم** (ترمذی باب ماجاء فی کراهیة ان یخص الامام نفسه بالدعاء) کوئی آدمی لوگوں کی امامت کرتے ہوئے دعا میں اپنے نفس کو خاص نہ کرے اگر ایسا کیا تو انہوں نے مقتدیوں کی خیانت کی۔

اولاً: عرض ایں کہ یہ حدیث متکلم فیہ ہے، علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے (ضعیف سنن الترمذی ص: ۳۸ و ضعیف سنن ابی داؤد ص: ۱۱۔۱۲)

امام ابن خزیمہ نے موضوع، امام ترمذی اور صاحب تحفہ علامہ عبدالرحمن مبارکپوریؒ نے "حسن" کہا ہے۔

ثانیاً: شارحین حدیث کا کہنا ہے کہ اس حدیث کا تعلق نماز کے اندر کی دعا، دعاء قنوت سے ہے، سلام کے بعد سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے (تحفۃ الاحوذی ۲/۳۴۴)

ثالثاً: سلام کے بعد امام کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے، یعنی امام و مقتدی کی نسبت نہیں رہتی ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **تحریمها التکبیر وتحلیلها التسلیم** (ابو داؤد ۹/۱ و ۹۱/۱) اگر امام کی اقتداء ختم نہ ہوتی تو پھر امام کے سلام پھیرنے کے بعد مسبوقین حضرات کا بقیہ رکعات پوری کرنے کے لیے اٹھنا جائز نہ ہوتا کیونکہ اس وقت امام بیٹھا ہوا رہتا ہے، لھذا اس حدیث سے بھی مرّوجہ دعا پر استدلال باطل ہے۔

(۴) **عن ابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم رفع یده بعد ما سلم و هو مستقبل القبلة فقال: اللهم خلص الولیدبن الولید**

وعیاش بن ابی ربیعة و سلمة بن هشام وضعفة المسلمین الذین لا یستطیعون حیلة ولا یهتدون سبیلاً (تحفة الاحوذی ۱۹۸/۲)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کے بعد قبلہ رخ کئے ہوئے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر یہ دعا کی: اللھم خلص الخ.

یہ حدیث تفسیر ابن کثیر، تفسیر ابن جریر، تحفۃ الاحوذی، فتاوٰی نذیریہ، فتاوٰی ثنائیہ، معارف السنن اور الاذکار المسنونۃ بعد الصلوٰۃ المکتوبۃ وغیرہ کتابوں میں ہے۔ لیکن اسکی سند میں ایک مشہور ضعیف راوی علی بن زید بن جدعان ہیں، جسکی وجہ سے یہ حدیث ضعیف ہے تفصیل آگے، ''کیا ہر ضعیف حدیث تعدد طرق کی بناء پر حسن ہو جاتی ہے؟'' کے زیر عنوان آرہی ہے ان شاء اللہ۔

پھر یہ حدیث ضعیف ہونے کے ساتھ ساتھ دو اعتبار سے صحیح احادیث کے خلاف بھی ہے،

اولاً: صحیح بخاری کے متعدد ابواب میں مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعاء نماز کے اندر رکوع سے سر اٹھانے کے بعد دعاء قنوت میں مانگی تھی (دیکھئے صحیح بخاری ۱۳۶/۱ و ۹۱۵/۲ وغیرہ)

ثانیاً: عام کتب حدیث میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ ''فلما سلم انحرف'' یا ''انصرف'' یا ''انفتل'' وغیرہ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سلام کے بعد مقتدیوں کی طرف رخ کر لیتے تھے، اور اس ضعیف حدیث میں یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سلام کے بعد قبلہ رخ ہو کر بیٹھے رہے، لھذا یہ حدیث بھی قابل استدلال نہیں رہ جاتی ہے۔

(۵) سنن ابی داؤد میں ہے: قال ابو زهیر النمیری: خرجنا مع رسول الله صلی الله علیه وسلم ذات لیلة، فاتینا علی رجل قد الح فی المسئلة، فقال النبی صلی الله علیه وسلم: او جب ان ختم، فقال

رجل من القوم: بای شئی یختم ؟ قال: بآمین (ابو داؤد ۱/۱۳۵)

ابوزہیر نمیری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم لوگ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نکلے، ہمارا گذر ایک ایسے آدمی کے پاس سے ہوا جو دعا پر اصرار کر رہا تھا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس کی دعا قبول کی جائیگی اگر وہ ختم کرے گا ایک آدمی نے کہا کس چیز سے ختم کرے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آمین کے ذریعہ۔

صاحب ''مرعاۃ المفاتیح'' نے اس حدیث کو ''حسن'' قرار دیا ہے (مرعاۃ المفاتیح ۱۵۷/۳) لیکن علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے (ضعیف سنن ابی داؤد ص: ۹۲ ومشکوۃ المصابیح بتحقیق البانی ۲۶۸/۱)

یہ حدیث فرض نماز کے بعد اجتماعی دعا کی تائید میں پیش کی جاتی ہے، لیکن اس سے تو صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص دعا کرے اور اپنی دعا کو ''آمین'' کے ذریعہ ختم کرے تو اس کی دعا قبول کی جائیگی، تعجب کی بات تو یہ ہے کہ آپ نے اس سے یہ کیسے استدلال کر لیا کہ فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر امام دعا کرے گا اور مقتدی حضرات آمین آمین کہتے جائیں گے، تب اس کی دعا قبول ہوگی ورنہ نہیں؟ حدیث کے الفاظ میں تو اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ الفاظ حدیث پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس آدمی کو شدید ضرورت درپیش تھی اس لئے وہ رات کی تنہائی میں انفرادی طور پر باصرار اللہ تعالٰی سے اپنی حاجات طلب کر رہا تھا، فرض نماز کا تو اس میں کہیں ذکر ہی نہیں، پھر ہاتھ اٹھانے کا نام ہی نہیں۔

(۶) الاسود العامری عن ابیه قال: صلیت مع رسول الله صلی الله علیه وسلم الفجر فلما سلم انحرف ورفع یدیه و دعا، الحدیث (تحفة الاحوذی ۱۹۹/۲)

اسود عامری اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں، انہوں نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرا تو مقتدی کی طرف منہ موڑ لیا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔

اس روایت کو انہی لفظوں کے ساتھ مولانا محمد صادق سیالکوٹی نے ''صلوٰۃ الرسول'' ص:۳۱۲ کے اندر، مفتی جمیل احمد نذیری نے ''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ نماز'' ص:۲۳۹ کے اندر، شیخ محی الدین نے ''البلاغ المبین'' کے اندر، حافظ سیوطی نے ''فض الوعاء'' کے اندر، اسی طرح فتاوٰی نذیریہ کے اندر تین جگہوں پر اور اعلاء السنن'' میں نقل کیا گیا ہے، اور سبھوں نے ''مصنف ابن ابی شیبہ'' کے حوالے سے بغیر سند کے ذکر کیا ہے، مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں ''رفع یدیہ ودعا'' (ہاتھ اٹھائے اور دعا کی) کا لفظ نہیں ہے۔

چنانچہ علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری ''تحفۃ الاحوذی'' ۱۹۹/۲ کے اندر رقمطراز ہیں: بعض علماء نے اس حدیث کو اسی طرح بغیر سند کے بیان کیا ہے اور مصنف ابن ابی شیبہ کی طرف منسوب کیا ہے، مگر مجھے اس کی سند نہیں ملی، اللہ ہی جانتا ہے یہ حدیث کیسی ہے؟ صحیح ہے یا ضعیف؟ اس حدیث پر تفصیلی جائزہ آگے ''کیا ہر ضعیف حدیث تعدد طرق کی بناء پر حسن ہو جاتی ہے؟'' کے زیر عنوان انشاء اللہ آرہا ہے۔

(۷) قال الحاكم اخبرنا الشيخ الامام ابو بكر بن اسحاق انا بشر بن موسى ثنا ابو عبد الرحمن المقرى ثنا ابن لهيعة قال حدثني ابو هبيرة عن حبيب بن مسلمه الفهرى، وكان مجاب الدعوة أنه امر على جيش فدرب الدروب فلما اتى العدو قال : سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول: لا يجتمع ملأ فيدعو بعضهم ويومن البعض الا اجابهم الله ، ثم انه حمد الله واثنى عليه ثم قال :اللهم

احقن دمائنا واجعل اجورنا اجور الشهداء (المستدرك على الصحيحين للحاكم ٣/ ٣٤٧)

امام حاکم اپنی سند سے بیان کرتے ہیں کہ حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ فہری مستجاب الدعوات تھے، ان کو ایک لشکر کا امیر بنایا گیا، جب وہ دشمن کی سرزمین میں داخل ہوئے اور دشمن کے سامنے آئے تو انھوں نے فرمایا: کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہوئے سنا کہ جب ایک جماعت جمع ہو کر ان میں بعض دعا کریں اور بعض آمین کہیں تو اللہ تعالی ان کی دعا قبول فرماتا ہے، پھر حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالی کی ثنا و تعریف کی اور یہ دعا مانگنے لگا ''اللھم احقن دمائنا واجعل اجورنا اجور الشهداء''

اس حدیث کو امام طبرانیؒ نے ''معجم کبیر'' کے اندر، امام حاکمؒ نے ''مستدرک'' کے اندر ابن لھیعہ قال حدثنی ابن ہبیر وھو ابو ہبیرہ عن حبیب بن مسلمہ فہری کی سند سے مرفوعاً روایت کیا ہے امام حاکمؒ اور امام ذہبی نے اس پر سکوت اختیار کیا اور علامہ ہیثمیؒ نے طبرانی کی طرف منسوب کرنے کے بعد فرمایا ''رجالہ رجال الصحیح غیر ابن لھیعہ وھو حسن الحدیث'' ابن لھیعہ کے علاوہ اس کے سب رواۃ صحیح کے رواۃ ہیں لیکن ابن لھیعہ حسن الحدیث ہیں۔

علامہ البانیؒ نے اسکو ضعیف قرار دیا ہے کیونکہ اس کی سند منقطع ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ عبداللہ بن ہبیرہ ابو ہبیرہ اگرچہ ثقہ راوی ہیں لیکن حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا ابن ھبیرہ کی ولادت اکتالیس ہجری میں ہوئی اور اس کے ایک سال بعد ہی ۴۲ ہجری میں حبیب بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی ہے۔ (سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ والموضوعۃ حدیث نمبر ۵۹۶۸)

دوسری بات یہ ہے کہ ابن لھیعہ کو اگرچہ علامہ ہیثمیؒ نے حسن الحدیث فرمایا ہے

لیکن دوسرے محدثین کے نزدیک وہ ضعیف ہیں لہذا ان کے بارے میں محدثین عظام کا فیصلہ ملاحظہ ہو۔

علامہ ہیثمیؒ کہتے ہیں کہ انکی حدیث حسن ہے (مجمع الزوائد ۱۰/۱۷۰) حافظ ابن حجر عسقلانیؒ "تقریب" میں لکھتے ہیں: یہ سچے ہیں اور ساتویں طبقہ کے راویوں میں شمار ہوتے ہیں، ان کی حدیث کے مجموعہ جل جانے کی وجہ سے ان میں اختلاط ہو گیا تھا ابن المبارکؒ اور ابن وہبؒ کی ان سے جو روایتیں ہیں وہ صحیح ہیں امام مسلمؒ نے انکی روایتیں متابعت کے طور پر نقل کی ہیں (تقریب التهذيب ص: ۱۴۰) امام یحیی بن معینؒ کہتے ہیں: وہ حدیث میں ضعیف ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں: وہ متروک الحدیث ہیں (الا باطيل والمناكير والصحاح والمشاهير للجورقانی ص: ۳۵۵)

علامہ جورقانی رحمہ اللہ کہتے ہیں: وہ ضعیف الحدیث ہیں، امام عبدالرحمن بن مہدیؒ کہتے ہیں: ان سے کچھ بھی روایت نہ کرو خواہ کم ہو یا زیادہ، امام یحیی بن سعیدؒ ان کی حدیث کو کچھ بھی شمار نہیں کرتے تھے (الا باطيل والمناكير والصحاح والمشاهير ۱/۱۴۰)

امام ابن ابی حاتمؒ فرماتے ہیں: میں نے اپنے والد اور ابوزرعہؒ سے افریقی اور ابن لہیعہؒ کے متعلق پوچھا تو دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا کہ وہ دونوں ضعیف ہیں، امام محمد بن سعیدؒ کہتے ہیں: ابن لہیعہ ضعیف ہیں، امام نسائیؒ فرماتے ہیں: وہ ثقہ نہیں ہیں، امام ابن معینؒ کہتے ہیں: وہ ضعیف الحدیث ہیں ان کی حدیث سے احتجاج جائز نہیں (بذل المجهود ۱/۸۸) اور علامہ منذریؒ کہتے ہیں: وہ حدیث میں ضعیف ہیں (عون المعبود ۱/۱۷۳)

امام ترمذیؒ فرماتے ہیں: ابن لہیعہ محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں، امام یحی بن

معینؒ وغیرہ نے انہیں ضعیف قرار دیا ہے، امام مسلمؒ فرماتے ہیں: وکیع بن الجراحؒ، یحیٰ بن سعید القطانؒ اور ابن مہدیؒ نے ان سے روایت کرنا چھوڑ دیا تھا، صاحب تحفہ فرماتے ہیں: وہ ضعیف ہونے کے ساتھ ساتھ مدلس بھی ہیں، ضعیف راویوں سے تدلیس کیا کرتے ہیں، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ ''طبقات'' میں فرماتے ہیں: ابن لہیعہ حضرمی مصری آخری عمر میں ان کو اختلاط ہو گیا تھا'' ان کی روایت میں بہت زیادہ مناکیر ہیں، امام ابن حبان فرماتے ہیں: وہ صالح تھے لیکن ضعیف راویوں سے تدلیس کیا کرتے تھے (جامع ترمذی مع تحفۃ الاحوذی ۱/۲۴۲)

اس بیان سے واضح ہو گیا کہ دو ایک اماموں کو چھوڑ کر تمام ائمہ نے ابن لہیعہ کو ضعیف قرار دیا ہے، یاد رہے کہ جب کسی راوی کے بارے میں جرح اور تعدیل دونوں کی گئی ہو تو جمہور کے نزدیک جرح مقدم مانی جائیگی اور یہی قول راجح بھی ہے۔ یعنی یہ مانا جائیگا کہ یہ راوی ضعیف ہے (دعاء کے آداب واحکام ص: ۱۳۳۔۱۳۴ اور امتاع العقول بروضۃ الاصول ۱/۶۹)

اسی لیے کسی سند میں ابن لہیعہ کا نام آجانے کو ہی علماء کرام ان کے ضعف کے لیے کافی سمجھتے ہیں، اب ناظرین کرام خود فیصلہ کریں کہ مذکورہ حدیث پر کس طرح اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

ثانیاً: اس حدیث سے فرض نماز کے بعد اجتماعی طور پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے پر استدلال کرنا اس لیے بھی صحیح نہیں، کہ نماز سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں ہے بلکہ ضرورت شدیدہ کے تحت کسی بھی وقت کی ہنگامی دعاؤں پر محمول ہے، چنانچہ علامہ عبید اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

رہ گئی حبیب بن مسلمہ فہری کی حدیث تو اس کے عموم سے استدلال کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ صلوۃ مکتوبہ یا تطوع کے بعد کی دعا کے علاوہ دوسری اوقات

کی ہنگامی دعاؤں پر محمول ہے۔

شب وروز کے چوبیس گھنٹوں میں پانچ مرتبہ مسجد نبوی میں نماز باجماعت ہوتی تھی، صحابہ کرام کا جم غفیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھتا تھا، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے اور صحابہ کرام کے آمین آمین کہنے کا دستور ہوتا تو ضرور منقول ہوتا، محرک ودواعی نقل موجود ہونے اور مانع کے مرتفع ہونے کے باوجود عدم نقل دلیل ہے عدم وقوع اور ترک کی لھذا حبیب بن مسلمہ فہری کی حدیث سے اس ہیئت پر استدلال مخدوش ہے (محدث بنارس جون ۱۹۸۲ء ص:۲۲)

(۸) قال ابو داؤد: حدثنا مؤمل بن الفضل الحرانی حدثنا عیسی یعنی ابن یونس حدثنا جعفر یعنی ابن میمون صاحب الانماط حدثنی ابو عثمان عن سلمان قال، قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ربکم حیی کریم یستحی من عبدہ اذا رفع یدیہ الیہ ان یردھما صفراً. (ابو داؤد کتاب الصلوۃ، باب الدعاء ۲۰۹/۱)

امام ابو داؤد اپنی سند سے بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارا پروردگار بڑا حیا والا اور کرم والا ہے، جب اس کا بندہ اسکی طرف دونوں ہاتھ اٹھاتا ہے تو انہیں خالی واپس کرتے ہوئے شرماتا ہے۔

اس حدیث کے بارے میں علامہ منذریؒ فرماتے ہیں: اس کو امام ترمذیؒ اور امام ابن ماجہؒ نے بھی روایت کیا ہے، امام ترمذی نے اسے ''حسن غریب'' کہا ہے، بعض لوگوں نے اسے موقوف روایت کہا ہے۔

اور صاحب ''عون المعبود'' فرماتے ہیں: اس کی سند میں جعفر بن میمون ابوعلی نمطی چادروں کے فروخت کرنے والے ہیں، ان کو امام یحیٰؒ بن معینؒ نے کبھی صالح کہا، کبھی ضعیف کہا اور کبھی کہا کہ یہ ثقہ نہیں ہیں، امام ابوحاتم رازیؒ کہتے ہیں: وہ صالح

تھے، امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا: یہ حدیث میں قوی نہیں ہیں، اور امام ابوعلیؒ فرماتے ہیں: مجھے امید ہے کہ ان میں کوئی مضائقہ نہیں (عون المعبود، باب الدعاء ۲۵۲/۴)

ان کے بارے میں صاحب ''عون المعبود'' اور صاحب ''بذل'' دونوں ''باب من ترک القرآۃ فی صلاتہ بفاتحۃ الکتاب'' کے تحت لکھتے ہیں کہ امام نسائیؒ نے فرمایا: وہ ثقہ نہیں ہیں، امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ: وہ حدیث میں قوی نہیں ہیں، امام ابن عدیؒ فرماتے ہیں: ان کی حدیث ضعفاء کے زمرے میں لکھی جائیگی (عون المعبود ۲۶/۳ وبذل المجہود ۴۸/۲)

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ تقریب میں لکھتے ہیں: جعفر بن میمون ابوعلی یا ابوالعوام نمطی چادروں کے فروخت کرنے والے سچے ہیں، حدیث بیان کرنے میں غلطی کرتے ہیں چھٹے درجے کے راویوں میں شمار ہوتے ہیں (تقریب التہذیب ص: ۴۴)

صاحب مرعاۃ: ''باب القرأۃ فی الصلوٰۃ'' کی ایک حدیث کی تشریح کرتے ہوئے جعفر بن میمون کے بارے میں لکھتے ہیں: امام بخاریؒ فرماتے ہیں: لیس بشئی یعنی یہ راوی کچھ بھی نہیں ہیں حد درجہ کے ضعیف ہیں، امام یعقوب بن سفیانؒ نے ان کو ان لوگوں کے زمرے میں شمار کیا ہے جن سے روایت کرنا جائز نہیں (مرعاۃ المفاتیح ۱۱۰/۳)

معلوم ہوا کہ یہ حدیث احتجاج کے لائق نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ یہ حدیث فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے پر صریح بھی نہیں ہے اس لیے اس سے استدلال صحیح نہ ہوگا، بالفاظ دیگر اس عام حدیث کو فرض نماز کے بعد کے ساتھ خاص کرنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے جو یہاں مفقود ہے۔

(۹) عن محمد بن ابی یحی الاسلمی قال: رأیت عبداللہ بن الزبیر ورای رجلاً رافعاً یدیہ قبل ان یفرغ من صلاتہ، فلما فرغ منھا قال: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لم یکن یرفع یدیہ حتی یفرغ

من صلاته (طبرانی، فض الوعاء اور تحفة الاحوذی ۱۹۹/۲)

محمد بن ابی یحیٰ اسلمی کا بیان ہے کہ میں نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ انہوں نے ایک شخص کو نماز کے اند دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہوئے دیکھا، جب وہ نماز سے فارغ ہوا تو ابن زبیر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہونے کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے تھے۔

اس حدیث کے بارے میں علامہ ہیثمیؒ نے ''مجمع الزوائد'' کے اندر ''رجالہ ثقات'' (اس کے سب راوی ثقہ ہیں) فرمایا ہے اور ان کی اتباع کرتے ہوئے علامہ سیوطیؒ نے بھی اپنی کتاب ''فض الوعاء'' میں ''رجالہ ثقات'' فرمایا ہے لیکن اصول حدیث سے واقفیت رکھنے والے حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ راوی کے ثقہ ہونے سے سند کا اتصال ثابت نہیں ہوتا، اور نہ ہی حدیث کا ضعف ختم ہوتا ہے، کیونکہ منقطع، مرسل اور معضل وغیرہ کے رواۃ بھی ثقہ ہوتے ہیں، نیز راوی اور سند کے صحیح ہونے کے باوجود متن شاذ اور معلل ہوسکتی ہیں، چنانچہ صاحب ''مرعاۃ'' ایک حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں: **وأما قول الهيثمي: "رجاله ثقات" فلا يدل على صحته، لأنه لا يلزم من كون رجال الحديث ثقات ان يكون صحيحاً"** (مرعاة المفاتيح ۱۰۵/٤)

لیکن علامہ ہیثمی کا یہ کہنا کہ ''اس کے سب راوی ثقہ ہیں'' حدیث کی صحت پر دلالت نہیں کرتا کیوں کہ کسی حدیث کے راوی کے ثقہ ہونے سے نفس حدیث کا صحیح ہونا لازم نہیں آتا۔

اس حدیث پر تفصیلی بحث ''کیا ہر ضعیف حدیث تعدد طرق کی بناء پر حسن ہو جاتی ہے'' کے زیر عنوان انشاء اللہ آگے آرہی ہے۔

(۱۰) بعض لوگ مروجہ اجتماعی دعا کی دلیل میں علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ کے

اس واقعہ کو پیش کرتے ہیں جس میں آیا ہے کہ انہوں نے فجر کی نماز کے بعد صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کی ایک جماعت کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر دعا کی تھی (البدایہ والنہایہ لابن کثیر)

ان لوگوں کی اس دلیل کا جائزہ لینے کے لیے پورے واقعہ سے واقف ہونا ضروری ہے، اس لیے ذیل میں ان کا واقعہ مفصلاً بیان کیا جارہا ہے، تاکہ حقیقت حال واضح ہوجائے۔

ابن سعدؒ کا بیان ہے کہ جعرانہ میں مال غنیمت تقسیم کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ کو بحرین روانہ کیا، اور صحیح بخاری جلد اول "باب الجزیۃ والموادۃ مع اہل الذمۃ والحرب" میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بحرین سے صلح کرلی اور علاء بن حضرمیؓ کو وہاں کا گورنر مقرر کردیا، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ یہ ۹ ہجری کا واقعہ ہے (فتح الباری مطبعہ خیریہ ۲/۱۶۴)

حافظ ابن کثیرؒ دمشقی اپنی کتاب " البدایہ والنہایہ" مجلد ثالث جزء سادس مطبعہ دار الکتاب العلمیۃ بیروت طبع اول "ذکر ردۃ اھل البحرین وعودھم الی الاسلام " کے تحت رقمطراز ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحرین کے بادشاہ منذر بن ساوی کو دعوت اسلام دینے کے لیے مشہور صحابی علاء بن حضرمیؓ کو روانہ کیا، چنانچہ منذر مسلمان ہوگیا، اور بحرین والوں نے بھی اسلام قبول کرلیا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوگیا اور اس کے چند روز بعد ہی منذر کی بھی وفات ہوگئی تو اہل بحرین سوائے اہل جواثا کے سب مرتد ہوگئے اور کہنے لگے کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی ہوتے تو ہرگز نہ مرتے.....

یہ خبر جب ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ملی تو انہوں نے علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ کو لشکروں کے ساتھ بحرین روانہ کیا... اتفاقاً اس سفر میں ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا، وہ

یہ ہے کہ جب مسلمان افواج ایک جگہ قیام کی غرض سے اترے تو ان کے تمام اونٹ (جن پر زادسفر، خیمے اور پینے کا پانی سب کچھ تھا) فرار ہو گئے یعنی ان کی اشیاء خورد ونوش اور خیمے وغیرہ کے ساتھ ان کے تمام اونٹ فرار ہو گئے، اور جملہ مسلمان دیکھتے ہی رہ گئے ایک بھی اونٹ نہیں پکڑ سکے، اب مسلمان فوجیوں کے پاس صرف وہی کپڑے بچ گئے جو وہ پہنے ہوئے تھے، اور کھانے، پینے کے لیے کچھ بھی نہ تھا، یہ واقعہ رات کا تھا لوگ بہت غمزدہ اور افسردہ ہوئے اور غور وفکر کرنے لگے کہ اب کریں تو کیا کریں؟... جب فجر کی اذان ہوئی تو علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو نماز پڑھائی "فلما قضی الصلوٰۃ جثا علی رکبتیہ و جثا الناس و نصب فی الدعاء ورفع یدیہ و فعل الناس مثلہ حتی طلعت الشمس وجعل الناس ینظرون الی سراب الشمس یلمع مرۃ بعد اخری و ھو یجتھد فی الدعاء فلما بلغ الثالثۃ اذا قد خلق اللہ الی جانبھم غدیراً عظیماً من الماء القراح.

"اور علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ نے جب نماز پوری کرلی تو اپنے گھٹنے کے بل بیٹھ گئے اور تمام لوگ گھٹنے کے بل بیٹھ گئے اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے لگے، لوگوں نے بھی ان کی طرح کیا، یہاں تک کہ آفتاب نکل آیا اور لوگ سراب کی طرف دیکھنے لگے جو چمک رہا تھا، اب بھی علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ دعا مانگنے میں مشغول ہیں، جب دن کے تین حصے میں سے ایک حصہ گذر گیا تو اچانک اللہ تعالیٰ نے ان کے قریب ہی میٹھے پانی کا ایک بہت بڑا تالاب بنا دیا"

اس کے بعد علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ اور تمام لوگوں نے اس تالاب میں جا کر پانی پیا اور غسل کیا، دن چڑھتے چڑھتے ان کے بھاگے ہوئے تمام اونٹ چاروں طرف سے واپس آنے لگے...

اخیر میں یہ ہوا کہ بحرین کے مرتدین سے جنگ ہوئی اور فتح کرلیا گیا۔

اولاً: عرض این کہ حافظ ابن کثیرؒ نے اس واقعہ کو بغیر سند کے ذکر کیا ہے اس لیے یہ معلوم نہ ہوسکا کہ اس کی سند کیسی ہے؟ صحیح ہے یا ضعیف؟

ثانیاً: فلما قضی الصلوٰۃ جثا علی رکبتیہ وجثا الناس " پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ سلام پھیر کر کھڑے ہوگئے تھے، اس کے بعد گھٹنے کے بل بیٹھے، کیوں کہ سلام کے بعد امام ومقتدی سبھی گھٹنے کے بل بیٹھے ہی رہتے ہیں، تو پھر دو بارہ یہ کہنا کہ "گھٹنے کے بل بیٹھ گئے" کیا معنی رکھتا ہے؟

ثالثاً: اس واقعہ میں یہ بات کہیں بھی مذکور نہیں کہ جب علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ دعا مانگ رہے تھے تب ان کے تمام ساتھیوں نے آمین آمین کہا، بلکہ "فعل الناس مثلہ" سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے ساتھی بھی ان کی طرح دعائیہ کلمات ہی کہتے تھے۔

رابعاً: پورے واقعہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی یہ دعا شدید ضرورت اور سخت حاجت کے تحت تھی، اور وہ حاجت اور ضرورت بھی اتنی شدید تھی کہ صلوٰۃ فجر کے بعد سے دعا مانگتے گئے مانگتے گئے یہاں تک کہ سورج طلوع ہوگیا، ریت کے ذرات چمکنے لگے اور دن کا ایک حصہ گذر گیا، پھر بھی وہ دعا میں مشغول ہی رہے، ایسے حالات میں تو انسان جب بھی چاہے انفرادی یا اجتماعی طور پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ سکتا ہے۔

مذکورہ وجوہات کی بناء پر اس اثر کو مروجہ اجتماعی دعا کی دلیل بنانا صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ اثر صلوات فرائض وتطوع کے بعد کی دعاؤں کے علاوہ کسی ضرورت کے تحت ہنگامی دعاؤں پر محمول ہے۔

(۱۱) عن صالح بن حسان عن محمد بن کعب عن ابن عباس

مرفوعاً: اذا دعوت الله فادع ببطون كفيك و لا تدع بظهور هما ، فاذا فرغت فامسح بهما وجهك.

ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب اللہ تعالیٰ سے مانگو تو اپنی دونوں ہتھیلیوں کا اندرونی حصہ اوپر کر کے مانگو، انکی ظاہری حصہ کو اوپر کر کے نہ مانگو اور دعا سے فارغ ہونے کے وقت ہتھیلیوں کو اپنے چہرہ پر پھیر لیا کرو۔

اس حدیث کو امام ابن ماجہ ؒ نے اپنی ''سنن'' کے اندر امام ابن نصرؒ نے ''قیام اللیل'' کے اندر امام طبرانیؒ نے ''معجم کبیر'' کے اندر اور امام حاکمؒ نے ''مستدرک'' کے اندر روایت کیا ہے،

محدث عصر علامہ محمد ناصر الدین البانیؒ نے اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے، کیوں کہ اس کی سند میں صالح بن حسان نام کا ایک راوی ہے جو ضعیف ہے، چنانچہ ذیل میں ان کے بارے میں علماء کرام کے اقوال درج کیے جا رہے ہیں:

امام بخاریؒ فرماتے ہیں: وہ منکر الحدیث ہیں یعنی ان سے روایت کرنا جائز نہیں ،امام نسائی فرماتے ہیں: وہ متروک الحدیث ہیں، امام ابن حبانؒ فرماتے ہیں: وہ گانے اور باجے میں مشغول رہتے تھے اور ثقہ راویوں کی طرف منسوب کر کے موضوع حدیثیں روایت کیا کرتے تھے، امام ابن ابی حاتم ؒ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے اس حدیث کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ یہ حدیث منکر ہے۔

علامہ البانیؒ مزید فرماتے ہیں: محمد بن کعب عن ابن عباس کی سند سے روایت کرتے ہوئے عیسیٰ بن میمون نے صالح بن حسان کی متابعت کی ہے جس کو ابن نصر نے روایت کیا ہے، لیکن اس متابعت سے دل مطمئن نہیں ہوتا ، کیونکہ ابن میمون کا حال قریب قریب صالح بن حسان ہی کی طرح ہے چنانچہ ابن میمون کے بارے میں

علماء کرام کے اقوال ملاحظہ ہو۔

امام ابن حبانؒ فرماتے ہیں کہ وہ بہت ساری حدیثیں روایت کرتے ہیں، لیکن تمام کی تمام موضوع ہیں، امام نسائیؒ فرماتے ہیں: وہ ثقہ نہیں ہیں۔

(مزید تفصیل کے لیے دیکھئے "ارواء الغليل فی تخريج أحاديث منار السبيل"، للالبانیؒ جلد دوم حدیث نمبر:۴۳۴)

دوسری بات یہ ہے کہ اس حدیث کا نماز سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے اس لیے بھی استدلال صحیح نہ ہوگا۔

(۱۲) عن انس ان النبی صلی الله عليه وسلم، رفع يديه حتی رايت بياض ابطيه (صحيح بخاری ۱/۱٤٠) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کئے یہاں تک کہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بغل کی سفیدی دیکھ لی۔

اولاً: اس حدیث کے راوی خود انس رضی اللہ عنہ نے اسکو استسقاء کے ساتھ خاص مانا ہے، چنانچہ ان کی روایت صحیح بخاری جلد اول "باب رفع الامام يده فی الاستسقاء" میں ان الفاظ کے ساتھ موجود ہے "كان النبي صلى الله عليه وسلم لا يرفع يديه فی شئی من دعائه الا فی الاستسقاء وانه يرفع حتی يری بياض ابطيه" یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف استسقاء کی دعاء میں ہاتھ اٹھاتے تھے، اتنا اوپر اٹھاتے کہ بغل کی سفیدی نظر آنے لگتی، اسی بناء پر امام ابن ماجہؒ نے اپنی سنن میں "باب من كان لا يرفع يديه فی القنوت" اور امام نسائیؒ نے اپنی سنن میں "ترک رفع اليدين فی الدعاء فی الوتر" باب بندھا ہے اور اس کے تحت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث "كان النبی صلی لله عليه وسلم لا يرفع يديه فی شئی من دعائه الا فی الاستسقاء" بیان کرتے ہیں یعنی یہ دونوں امام بھی اس حدیث کو استسقاء کے ساتھ خاص مانتے ہیں۔

ثانیاً: اگر اس حدیث سے فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا ثابت ہوتا تو امام بخاریؒ ہی استدلال کرنے کے زیادہ حق دار تھے، کیوں کہ آں رحمہ اللہ نے اپنی صحیح کے "کتاب الدعوات "میں باب باندھا ہے "باب الدعاء بعد الصلوٰۃ" یعنی فرض نماز کے بعد دعا مانگنا (باب کا یہ ترجمہ حافظ ابن حجرؒ کے مطابق کیا گیا) سوچنے کی بات یہ ہے کہ آں رحمہ اللہ نے اس باب میں انس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو بیان نہ کر کے، تسبیح اور تحمید وغیرہ کی حدیث بیان کرتے ہیں اور دوسری حدیث یہ بیان کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرض نماز کے بعد یہ دعا کہتے تھے" لا اله الا الله وحده لا شریک له ، له الملک وله الحمد وهو علی کل شئی قدیر ، اللهم لا مانع لما اعطیت ، ولا معطی لما منعت ، ولا ینفع ذا الجد منک الجد" اور انس رضی اللہ عنہ کی حدیث "رفع یدیه حتی رأیت بیاض ابطیه" کو "باب رفع الناس ایدیهم مع الامام فی الاستسقاء" اور "باب رفع الأیدی فی الدعاء "میں بیان کرتے ہیں۔

ثالثاً: یہ حدیث زیر بحث مسئلہ پر دلالت کرنے میں صریح نہیں ہے، اس لیے بھی اس سے استدلال کرنا صحیح نہ ہوگا، بالفاظ دیگر اس عام حدیث کو فرض نماز کے بعد کے ساتھ خاص کرنے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے جو یہاں مفقود ہے۔

انتباہ

مذکورہ بیان سے ان لوگوں کی بھی تردید ہو جاتی ہے جو لوگ کہتے ہیں کہ "امام بخاریؒ فرائض کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کے قائل تھے" کیونکہ اگر معاملہ ویسا ہی ہوتا تو امام بخاریؒ انسؓ کی حدیث "رفع یدیه حتی رأیت بیاض ابطیه" کو "باب رفع الناس ایدیهم مع الامام فی الاستسقاء اور باب رفع الایدی

فـي الـدعـاء "کے ساتھ ساتھ "باب الدعاء بعد الصلوۃ" میں بھی بیان کر دیتے اور معاملہ صاف ہو جاتا، لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ آں رحمہ اللہ نے انسؓ کی مذکورہ حدیث کو پہلے دونوں بابوں میں تو بیان کر دیا اور تیسرے باب میں بیان نہیں کیا؟ یہی دلیل ہے اس بات کی کہ امام بخاریؒ فرائض کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کے قائل نہیں تھے۔

(۱۴) عن انسؓ قال: اتی رجل من اهل البدو الی رسول الله صلی الله علیه و سلم یوم الجمعة فقال: یا رسول الله صلی الله علیه وسلم، هلکت الماشیة، هلک العیال، هلک الناس، فرفع رسول الله صلی الله علیه وسلم یدیه یدعو و رفع الناس أیدیهم مع رسول الله صلی الله علیه وسلم یدعون قال: فما خرجنا من المسجد حتی مطرنا، الحدیث (صحیح بخاری ۱/۱۴۰)

ایک دیہاتی جمعہ کے دن (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ کے دوران) مسجد کے اندر آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر کہا اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمام مویشی، اہل وعیال اور تمام لوگ ہلاک ہو گئے۔ (لہذا آپ بارش کے لیے دعا کر دیجئے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھالئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لوگوں نے بھی دعا میں ہاتھ اٹھائے، راوی کا بیان ہے کہ ہم لوگ ابھی مسجد سے نکلے بھی نہیں تھے کہ بارش ہونے لگی۔

یہ حدیث مروجہ اجتماعی دعا کی دلیل میں پیش کی جاتی ہے، طریقہ استدلال یہ ہے کہ اس طرح کا دعا میں ہاتھ اٹھانا اگرچہ استسقاء کے متعلق آیا ہے، لیکن اس کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ عام ہے اسی لیے امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کے "کتاب الدعوات" میں اس حدیث سے مطلق دعا میں رفع یدین پر استدلال کیا ہے، لیکن یہ

استدلال چند وجوہات کی بناء پر مخدوش ہے۔

اولاً: گزشتہ صفحات میں مذکور ہوا کہ دعا عبادت ہے اور عبادت جہاں پر جس طرح ثابت ہے وہاں پر اسی طرح ادا کرنا ضروری ہے اور مروجہ اجتماعی دعا کا ثبوت نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ہے نہ فعل سے اور نہ تقریر سے۔

ثانیاً: خود امام بخاریؒ نے اس حدیث کو استقاء پر محمول کیا ہے کیونکہ آں رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ''باب رفع الناس ایدیھم مع الامام فی الاستقاء کے اندر ذکر کیا ہے۔

ثالثاً: صحیح بخاری ''كتاب الدعوات'' ''باب رفع الأيدي في الدعاء '' کے اندر یہ حدیث ان الفاظ کے ساتھ نہیں ہے۔ اس میں انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی ایک حدیث ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ''رفع يديه حتى رأيت بياض ابطيه'' اس لیے آپ کا کہنا کہ ''امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کے ''کتاب الدعوات'' میں اس حدیث سے مطلق دعاء میں رفع یدین پر استدلال کیا ہے'' درست نہیں ہے۔

رابعاً: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دعا میں یہ رفع یدین ضرورت شدیدہ کے تحت تھا، اس لیے اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے کسی ضرورت کے تحت کسی بھی وقت اگر امام و ماموم دعا میں ہاتھ اٹھائیں تو جائز ہے۔

خامساً: اس حدیث کا نماز سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

سادساً: اس حدیث سے ایک بات ضرور معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس مروجہ دعا کا رواج نہیں تھا ورنہ وہ صحابی سلام کے بعد ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست کرتے، اور اس طرح خطبہ جمعہ کے دوران دعا کی درخواست نہ کرتے، مثلاً ہمارے علاقے میں جہاں اس دعا کا رواج

ہے وہاں لوگ سلام کے بعد ہی درخواست کرتے ہیں کہ فلاں ضرورت کے لیے دعا کر دیجیے، لہٰذا اس حدیث سے بھی مروجہ دعا کا استدلال صحیح نہ ہوگا۔

(۱۴)"کان موسی علیہ السلام یدعو و یومن ھارون علیہ السلام" موسیٰ علیہ السلام دعا کرتے تھے اور ہارون علیہ السلام آمین کہتے تھے۔

اس کو عسکری نے "تصحیفات" کے اندر "زربی ابی یحی قال : سمعت انس بن مالک یقول قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کی سند سے بیان کیا ہے۔

اس حدیث کو مروجہ اجتماعی دعا کی دلیل کے طور پر پیش کی جاتی ہے لیکن چند وجوہات کے بناء پر اس سے استدلال کرنا جائز نہیں۔

اولاً: یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ زربی ابی یحی ضعیف راوی ہے چنانچہ حافظ ذہبیؒ "الکاشف" کے اندر فرماتے ہیں کہ یہ واہی راوی ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے اپنی کتاب "تقریب" میں ان کو ضعیف قرار دیا ہے (سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ حدیث نمبر ۵۹۵۵)

ثانیاً: اس حدیث میں ہاتھ اٹھانے کا ذکر نہیں۔

ثالثاً: اس میں نماز کا کوئی تذکرہ ہی نہیں۔

مروجہ اجتماعی دعا کے قائلین سے گذارش ہے کہ وہ مذکورہ تمام دلائل اور ان کے جوابات کا بغور مطالعہ کریں اور سوچیں کہ کیا ان دلائل سے مروجہ دعا کا ثبوت ملتا ہے؟ قابل غور بات یہ ہے کہ ہم جس چیز کو سنت مستحب یا جائز سمجھتے ہیں اس کی سنیت، استحباب اور جواز کی ہمارے پاس کیا دلیل ہے؟ کیا ہماری دلیل اس قابل ہے کہ اس سے استدلال کیا جا سکتا ہے؟ اگر نہیں تو پھر ہم ایسے کاموں کو کیوں نہ چھوڑ دیں جن کا کوئی ثبوت نہیں ہے؟

عموم کی بھی حد ہوتی ہے

عموم کی بھی حد ہوتی ہے۔ اس کے حدود میں رہ کر ہی اس سے استدلال کیا جائے اگر اس کے اندر لاعلی التعین وسعت دے دی جائے تو پھر دنیا بھر میں کوئی بھی، بدعت، بدعت نہیں رہ جائے گی کیونکہ ہر بدعت کے لیے اس کے عاملین حضرات کے پاس عموم سے کوئی نہ کوئی دلیل ضرور ہے، مثلاً نماز سے قبل زبان سے نیت کرنے والے حضرات صحیح بخاری کی حدیث "انما الاعمال بالنیات" کے عموم سے دلیل پکڑتے ہیں، اور حدیث "من صلی علی واحدة صلی اللہ علیه عشراً" (جو شخص میرے اوپر ایک مرتبہ درود پڑھے گا اللہ تعالی اس کو دس نیکیاں دے گا) کے عموم سے مدراس کی بعض مساجد میں ہر اذان واقامت سے پہلے موذن زور زور سے درود ابراہیمی پڑھتا ہے۔ اور حدیث "کنت نهيتكم عن زيادة القبور الا فزوروها ، فانها تذكر الأخرة" (میں نے تم لوگوں کو قبروں کی زیارت کرنے سے منع کیا تھا، سنو، اب تم لوگ اس کی زیارت کر سکتے ہو کیوں کہ قبروں کی زیارت آخرت یاد دلاتی ہے) کے عموم سے استدلال کرتے ہوئے بزرگین اور صالحین کی مزاروں کی زیارت کرنے کو کچھ لوگوں نے سنت قرار دیا ہے اسی طرح حدیث "اماطة الاذی عن الطریق" (راستہ سے تکلیف دہ چیزوں کو ہٹانا ایمان کا جزء ہے) کے عموم سے بعض لوگوں نے قبروں پر چراغاں کرنے کی دلیل لی ہے، کیونکہ اس سے مسافروں کی تکلیف دور ہوتی ہے اور اس سے قبرستان کے پاس سے گذرنا آسان ہو جاتا ہے اس کے علاوہ اور بہت ساری مثالیں دی جا سکتیں ہیں لیکن اختصار کو ملحوظ رکھتے ہوئے انہیں مثالوں پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

عموم سے استدلال کرنے والے ذرا سوچیں کہ کیا مذکورہ چیزیں سنت یا مستحب

ہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ آپ کے استدلال اور ان کے استدلال میں کون سا فرق رہ جاتا ہے؟

سنت کسے کہتے ہیں؟

مختلف الفاظ میں سنت کی مختلف تعریفیں کی گئیں ہیں جن میں سے سترہ ۱۷ تعریفوں کو علامہ محمد اسماعیل سلفی گجرانوالہ رحمہ اللہ نے مع حوالجات اپنے مقالہ ''جماعت اسلامی کا نظریہ حدیث'' کے اندر جمع کر دیا ہے، مناسب یہ ہے کہ اس کے لیے ''حجیت حدیث'' ص: ۲۳۳-۲۳۵ کا مراجعہ کر لیا جائے۔

ان تعریفات کا خلاصہ یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال، افعال، تقاریر اور اوصاف کو سنت کہتے ہیں۔

سنت کی یہ تعریف: مرعاۃ المفاتیح ۲۳۶/۱ اور ''امتاع العقول'' ۵۲/۱ میں بھی دیکھی جا سکتی ہے، علاوہ ازیں مشہور تابعی اور مجدد شریعت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ سنت کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں: فان السنة انما سنها من قد علم مافي خلافها (ابو داؤد ٦٣٣/٢) سنت اس چیز کو کہتے ہیں: جس کو اس شخص نے نافذ کیا ہے، جو جانتا ہے کہ اس کے خلاف کرنے سے کیا گناہ ہے یعنی جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری کیا ہے اس کو سنت کہتے ہیں۔

اور علامہ ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ سنت کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں: السنة ما سنه رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من واجب او مستحب (تحفۃ المودود باحکام المولود ص: ۱۰۳) سنت اس چیز کو کہتے ہیں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری کیا ہو خواہ وہ واجب ہو یا مستحب یعنی خواہ وہ سنت مؤکدہ ہو یا غیر مؤکدہ۔

ان تعریفات کی بنیاد پر مذکورہ مسئلہ کو سنت قرار دینا کہاں تک درست ہے؟ اس

کا فیصلہ خود ناظرین کرام کر سکتے ہیں، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل، یا تقریر سے فرض نماز کے بعد امام کا ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا اور مقتدی حضرات کا آمین آمین کہتے جانا ثابت ہے؟ اگر نہیں، تو پھر اسے سنت کس دلیل کی بناء پر کہا جا رہا ہے؟

جواز یا مباح کسے کہتے ہیں؟

المباح في الاصطلاح: هو ما ذون في فعله و تركه و بلا مدح او ذم لفاعله اوتاركه (امتاع العقول ۱/۱۲)

اصطلاح میں جائز یا مباح اس کام کو کہتے ہیں جس کے کرنے اور چھوڑنے دونوں کی اجازت ہو اور جس کے کرنے والے کی تعریف یا چھوڑنے والے کی مذمت نہ کی گئی ہو اس تعریف پر وہ حضرات غور کریں جو کہتے ہیں کہ مروجہ اجتماعی دعا کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہے، کیا اس طرح کی بھی کوئی دلیل ہے؟

بدعت کسے کہتے ہیں؟

(۱) علامہ عبید اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: البدعة ما احدث في الدين مالا اصل له في الشريعة يدل عليه (مرعاة المفاتيح ۱/۲٦٤)

(۲) دکتور محمود الطحان رقمطراز ہیں: البدعة اصطلاحاً: الحدث في الدين بعد الاكمال، او ما استحدث بعد النبي صلى الله عليه وسلم من الاهواء والاعمال (تيسير مصطلح الحديث ص: ۱۲۳)

(۳) حافظ ابن رجب اپنی کتاب ''جامع العلوم'' میں فرماتے ہیں: المراد بالبدعة ما احدث ما لا اصل له في الشريعة يدل عليه (تحفة الاحوذی ۷/٤۳۹ وعون المعبود ٤/۳۳۰)

(۴) مولانا ابو الوفاء ثناء اللہ امرتسریؒ فرماتے ہیں: بلا وجہ شرعی، کسی کام کو موجب ثواب سمجھنا ہی بدعت ہوتا ہے یعنی جس کام کو شریعت نے ثواب نہ کہا ہو اسے ثواب سمجھنا یہی بدعت ہے (اہل حدیث کا مذہب، ص: ۴۱۔۴۲)

(۵) مولانا فضل اللہ سلفی لکھتے ہیں: اصطلاح میں بدعت اس فعل کو کہتے ہیں، جو ثواب کی نیت سے کیا جائے، جس کی شریعت میں کوئی اصل نہ ہو (بدعت اسباب اور نتائج ص: ۱۶ بحوالہ الاعتصام للشاطبی ۱/۳۶)

(۶) شریعت میں بدعت اس چیز کو کہتے ہیں، جس کو اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایجاد کی گئی ہو، اسے نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ہو، نہ اس کے کرنے کا حکم دیا ہو، نہ اس پر اپنی رضامندی ظاہر فرمائی ہو، اور نہ اسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کیا ہو (بدعات اور ان کا شرعی پوسٹ مارٹم ص: ۴۷)

مختلف الفاظ میں کی گئی بدعت کی تعریفوں کا خلاصہ یہی ہے کہ جس چیز کا قرآن وحدیث میں ثبوت نہ ہو اور دین سمجھ کر ثواب کی نیت سے اس کو کیا جائے، وہ بدعت ہے، چونکہ مروجہ اجتماعی دعا بعد نماز پنجگانہ کا ثبوت قرآن وحدیث میں نہیں ہے اس لیے بدعت ہے۔

عدم جواز کی دلیل

بعض لوگ کہتے ہیں کہ مروجہ اجتماعی دعا کے عدم جواز کی دنیا میں کوئی دلیل نہیں، نہ صحیح حدیث سے، نہ ضعیف حدیث سے۔

ان حضرات کی خدمت میں صرف اتنی باتیں عرض کر دینی مناسب ہوگی کہ جو لوگ شب برأت مناتے ہیں، محفل میلاد منعقد کرتے ہیں اور اس میں قیام کرتے ہیں،

عیدغدیرخم مناتے ہیں، احتیاطی ظہر پڑھتے ہیں، جمعۃ الوداع پڑھتے ہیں، قرآن خوانی اور ایصال ثواب کرتے ہیں، اور ان کے علاوہ دیگر بدعات وخرافات کرنے والے حضرات بھی تو یہی کہتے ہیں کہ ان سب چیزوں کے عدم جواز کی دنیا میں کوئی دلیل نہیں ہے، لھذا ان بدعتیوں میں اور آپ میں کون سا فرق رہ جاتا ہے؟

مذکورہ تمام چیزوں کی تردید میں آپ بھی جواباً یہی کہیں گے کہ یہ سب نئی چیزیں ہیں، جن کو لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اپنی طرف سے ایجاد کرلیا ہے، شریعت میں ان کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **وشر الامور محدثاتها و كل بدعة ضلالة** (صحیح مسلم ۲۸۵/۱) اور سب سے برا کام دین میں نئی چیز کا پیدا کرنا ہے یعنی بدعت سب سے برا کام ہے، اور ہر بدعت گمراہی ہے (خواہ اسکو ضروری سمجھ کر کرے یا غیر ضروری سمجھ کر کرے) نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ايـاكـم ومـحـدثـات الامور فان كل محدثة بدعة و كل بدعة ضلالة** (ابو داؤد ۶۳۵/۲)

اپنے آپ کو نئی چیز سے بچاؤ کیونکہ ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اسی طرح صحیحین میں فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہے: جس نے شریعت میں کوئی نئی چیز یعنی بدعت پیدا کردی جو اس میں نہیں تھی تو وہ باطل اور مردود ہے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے کوئی ایسا کام کیا جس کا ہم نے حکم نہیں دیا ہے تو وہ کام باطل اور مردود ہے (صحیح مسلم ۷۷/۲)

کیا مذکورہ تمام احادیث مروجہ اجتماعی دعا کے عدم جواز کے دلائل نہیں ہیں؟ ہاں مروجہ اجتماعی دعا کے عدم جواز کے دلائل اور بھی ہیں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے **ادعو ربكم تـضرعاً وخفيةً انه لا يحب المعتدين** (سورہ اعراف آیت: ۵۵) تم اپنے پروردگار سے گڑگڑا کر اور چپکے چپکے دعا کیا کرو۔ کیونکہ اللہ تعالی دعا میں حد سے تجاوز

کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔اس آیت کریمہ میں دعا کے دو آداب بیان کیے گئے ہیں (۱) ایک عاجزی اور تضرع کے ساتھ ہونا (۲) خفیہ اور آہستہ ہونا۔

معتدین کی تفسیر میں محشی جلالین لکھتے ہیں: ابن جریج نے فرمایا: کہ اس سے مراد دعا میں آواز بلند کرنے والے ہیں، نیز دعا میں چلانا مکروہ اور بدعت ہے۔

مشہور تابعی سعید بن المسیبؒ نے بلند آواز سے دعا کرنے کو بدعت قرار دیا ہے (دعاء کے آداب واحکام ص:۸۷)

ابن جریج رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حد سے تجاوز کی ایک صورت یہ ہے کہ دعا میں آواز بلند کی جائے، دیکھئے حاشیہ جلالین نیز دیکھئے معارف القرآن تفسیر سورہ اعراف آیت:۵۵

ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ لوگ بلند آواز سے دعا کرنے لگے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگو! اپنے تئیں آرام دو اور ذرا آہستہ پکارو، کیونکہ تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکار رہے ہو، بلکہ تم جس کو پکار رہے ہو وہ سننے والا بھی ہے اور تم سے قریب بھی ہے (متفق علیہ)

اور مروجہ اجتماعی دعا میں امام باواز بلند دعا کرتا ہے اور مقتدی حضرات بھی آمین باواز بلند ہی کہتے ہیں اس لیے یہ صورت قرآن وحدیث کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ مسبوقین حضرات کی نماز میں خلل ڈالتی ہے جو عدم جواز کی قاطع اور بین دلیل ہے، چنانچہ مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ہمارے زمانہ کے ائمہ مساجد کو اللہ تعالیٰ ہدایت فرماویں کہ قرآن وسنت کی اس تلقین اور بزرگان سلف کی ہدایات کو یکسر چھوڑ بیٹھے، ہر نماز کے بعد دعا کی ایک مصنوعی سی کارروائی ہوتی ہے، بلند آواز سے کچھ کلمات پڑھے جاتے ہیں جو آداب دعا کے خلاف ہونے کے علاوہ ان نمازیوں کی نماز میں بھی خلل انداز ہوتے ہیں جو مسبوق

ہونے کی وجہ سے امام کے فارغ ہونے کے بعد اپنی باقی ماندہ نماز پوری کر رہے ہیں۔ غلبہ رسوم نے اس کی برائی اور مفاسد کو ان کی نظروں سے اوجھل کر دیا ہے (معارف القرآن: ۳/ ۱۶۸)

قابل ذکر بات یہ ہے کہ مروجہ دعا کا جب سے رواج پڑا تبھی سے اس کی تردید شروع ہوگئی چنانچہ آج سے سات سو سال قبل شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ علیہ (متوفی ۷۲۸ھ) اپنے فتاویٰ میں، ان کے شاگرد علامہ ابن القیم رحمہ اللہ (متوفی ۷۵۱ھ) اپنی مایہ ناز کتاب ''زاد المعاد'' میں، علامہ شاطبی رحمہ اللہ (متوفی ۷۹۰ھ) اپنی کتاب ''الاعتصام'' میں، علامہ امیر یمانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۱۸۲ھ) ''سبل السلام'' ۱/ ۳۳۷ و ۴/ ۱۶۲۹ میں، مولانا عبدالتواب ملتانی مترجم اردو بلوغ المرام ص: ۴۶۷ میں، علامہ مجد الدین فیروز آبادی صاحب ''القاموس'' اپنی کتاب ''سفر السعادۃ'' میں، علامہ ابن باز رحمۃ اللہ علیہ اپنے فتاویٰ ۱/ ۸۱ میں اور علامہ عبید اللہ رحمانی استفتاء کے جواب میں نیز ان کے علاوہ بہت سارے متقدمین علماء کرام رحمہم اللہ مروجہ دعا کی تردید کرتے آرہے ہیں۔

اسی طرح محدث عصر علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ اپنی مایہ ناز کتاب سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ والموضوعۃ (۶/ ۶۰ حدیث نمبر ۲۵۴۴) کے تحت فرماتے ہیں، جملۃ القول: انه لم يثبت عن النبي صلى الله عليه وسلم انه كان يرفع يديه بعد الصلوٰة اذا دعا، واما دعاء الامام وتأمين المصلين عليه بعد الصلوٰة، كما هو المعتاد اليوم في كثير من البلاد الاسلامية فبدعة لا اصل لها.

حاصل کلام یہ ہے کہ نماز کے بعد کی دعاؤں میں ہاتھ اٹھانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے، اور نماز کے بعد امام کا دعا کرنا اور مقتدی حضرات کا ان

کی دعا پر آمین کہنا جیسا کہ بہت سارے اسلامی ممالک میں اس کا رواج پڑ چکا ہے تو یہ کسی بھی حدیث سے ثابت نہیں ہے جسکی وجہ سے یہ بدعت ہے۔

کیا قرآن وحدیث سے مروجہ اجتماعی دعا کی ممانعت ثابت ہے؟

اگر ہم قرآن وحدیث پر غور کریں تو ہمیں آسانی کے ساتھ مروجہ اجتماعی دعا کی ممانعت مل سکتی ہے چنانچہ اللہ تعالٰی فرماتا ہے "وما اتاکم الرسول فخذوہ ومانھاکم عنه فانتھوا" (سورہ حشر آیت : ۷) رسول اللہ ﷺ جس چیز کا حکم دیں اسے مان لو اور جس چیز سے منع کریں اسے چھوڑ دو۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول، فعل اور تقریر کے ذریعہ کرنے کا حکم دیا ہے اسے کرو اور آپ ﷺ نے جن چیزوں سے اپنے عدم قول اور ترک فعل وعدم فعل کے ذریعہ منع کیا ہے اسے نہ کرو، اور مروجہ اجتماعی دعا سے آپ نے ترک فعل وعدم فعل کے ذریعہ منع کر دیا ہے اس لیے یہ جائز نہیں ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول (سورہ محمد آیت: ۳۳) اللہ اور اسکے رسول کی اطاعت کرو نیز ارشاد ہوتا ہے ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی (سورۃ آل عمران آیت ۳۱) اگر تم لوگ اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، مذکورہ آیت کریمہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت جس طرح آپ کے قول، فعل اور تقریر میں ضروری ہے اسی طرح نفی، نہی اور عدم فعل وترک فعل میں بھی آپ کی اتباع ضروری ہے یعنی جو عمل آپ نے نہیں کیا ہے

اور نہ ہی کرنے کا حکم دیا ہے، اسے نہ کرنا ہی سنت ہے اور مروجہ اجتماعی دعا آپ نے کبھی بھی نہیں کیا اگر آپ کئے ہوتے تو ضرور منقول ہوتی لہذا عدم نقل ہی عدم وقوع کی دلیل ہے اور عدم وقوع ہی عدم جواز اور ممانعت کی بین دلیل ہے۔

فائدہ!

علامہ شمس الحق عظیم آبادی اپنی کتاب ''عون المعبود'' کتاب الصلوۃ، باب الدعاء'' کے اندر اور ملا علی قاری اپنی کتاب ''مرقات'' کے اندر اور محدث کبیر علامہ عبیداللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''مرعاۃ المفاتیح'' کتاب الدعوات، الفصل الثالث میں یزید بن سعید کی حدیث ''ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا دعا فرفع یدیہ مسح وجھہ بیدیہ'' کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: قال الطیبی : دل علی انہ اذا لم یرفع یدیہ فی الدعاء لم یمسح، وھو قید حسن لانہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یدعو کثیراً کما فی الصلوۃ والطواف وغیرھما من الدعوات الماثورۃ دبر الصلوات، وعند النوم وبعد الاکل وامثال ذلک ولم یرفع یدیہ لم یمسح بھما وجھہ''.

علامہ طیبیؒ فرماتے ہیں: یہ حدیث بتا رہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا میں ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے تب چہرے پر ہاتھ پھیرتے بھی نہیں تھے، اور یہ بہترین قید ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت سارے مواقع میں دعا کرتے تھے جیسا کہ نماز کے اندر، طواف میں اور ان کے علاوہ نمازوں کے بعد، سونے کے وقت اور کھانے کے بعد وغیرہ ادعیہ ماثورہ میں ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ کو چہرے پر پھیرتے تھے۔

دیکھا آپ نے مذکورہ تمام شارحین حدیث نے معاملہ صاف کر دیا کہ نماز کے

بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم دعا تو کرتے تھے مگر اس دعا میں ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔

کیا ہر ضعیف حدیث تعدد طرق کی بناء پر حسن ہو جاتی ہے؟

تعدد طرق یا کثرت طرق کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی حدیث لفظاً و معنیً یا صرف معنیً کئی اسانید سے مروی ہو، اگر ہر سند کے صحابی الگ الگ ہوں تو اسے اصولیین کی اصطلاح میں شاہد کہتے ہیں لیکن اگر صحابی متحد رہے اور اس کے بعد کوئی راوی اس حدیث کو روایت کرنے میں کسی کی موافقت کرے تو اسے متابعت کہتے ہیں۔

تعدد طرق کے فوائد میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ اس سے بعض ضعیف حدیث حسن کے درجہ میں پہنچ جاتی ہے، جیسا کہ علامہ سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کسی حدیث کا راوی صادق و امین ہونے کے ساتھ ساتھ سوء حفظ، اختلاط یا تدلیس سے بھی متصف ہو تو متعدد سندوں سے مروی ہونے کی وجہ سے اس کے متن کا مجموعہ حسن کے درجہ میں پہنچ جائیگا، کیونکہ اس وقت اس پر ظن غالب ہو جائے گا کہ اس نے اس حدیث کو یاد رکھا ہے (فتح المغیث ۱/۸۲-۸۳)

آگے بڑھنے سے قبل بطور نمونہ چند ایسی حدیثیں پیش کی جارہی ہیں جن کے بارے میں محدثین و شارحین نے صراحت کردی ہے کہ یہ حدیث متعدد ضعیف طرق سے مروی ہے جن کو اگر الگ الگ دیکھا جائے تو ان سے احتجاج جائز نہیں لیکن ان کے مجموعہ سے تقویت حاصل ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے یہ حدیث قابل احتجاج ہے،

چنانچہ "من وسع علی عیاله فی النفقة یوم عاشوراء وسع الله علیه سائر سنته" (جو شخص ماہ محرم الحرام کی دسویں تاریخ کو اپنے اہل و عیال پر زیادہ سے زیادہ خرچ کرے گا اللہ تعالی اس کی سال بھر کی روزی میں وسعت دیگا) کے سلسلے میں امام

بیہقیؒ ''شعب الایمان'' کے اندر اور علامہ عبیداللہ مبارکپوریؒ ''مرعاۃ المفاتیح'' کے اندر اس کے شواہد بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ اسانید اگرچہ ضعیف ہیں لیکن ایک دوسرے کی تائید سے اس کو تقویت حاصل ہو جاتی ہے (مرعاۃ المفاتیح ۳۶۴/۶) اور علامہ سخاویؒ ''المقاصد الحسنۃ'' کے اندر فرماتے ہیں کہ تین دن کے بعد عیادت کرنے کی حدیث چند ضعیف طرق سے مروی ہے جن کے ایک دوسرے کے ساتھ ملنے سے اس کو تقویت حاصل ہو جاتی ہے (مرعاۃ المفاتیح ۲۷۸/۵) اسی طرح علامہ شوکانی اور شارح ترمذی علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہما اللہ جمعہ کے دن امام کے خطبہ کے دوران احتباء سے ممانعت کی احادیث کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ احادیث اگرچہ ضعیف ہیں لیکن ایک دوسرے کی تائید سے مضبوط ہو جاتی ہیں (تحفۃ الاحوذی ۴۶/۳۔۴۷) اسی طرح حدیث '' لا وضوء لمن لا یذکر اسم اللہ علیه'' (وضوء کے شروع میں بسم اللہ نہ پڑھنے سے وضوء نہیں ہوتا) کے سلسلے میں حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ ابن صلاح رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث متعدد ضعیف سندوں سے مروی ہے اور بعض بعض کو تقویت دینے کی وجہ سے حسن ہو جاتی ہے (عون المعبود ۱۲۲/۱)

مذکورہ بیان سے یہ اخذ کرنا بالکل غلط ہوگا کہ ہر ضعیف حدیث کثرت طرق سے حسن ہو جاتی ہے، جیسا کہ دور حاضر کے بعض علماء سے بلا تکلف یہ کہتے ہوئے سنا جا رہا ہے کہ تعدد طرق سے ضعیف حدیث حسن ہو جاتی ہے حالانکہ بلا قید و شرط ہر ضعیف حدیث کے بارے میں اس طرح کا نظریہ رکھنا ایک خطرناک غلطی ہے، کیونکہ محدثین و اصولیین کا متفق علیہ قاعدہ ہے کہ جب حدیث کا ضعف شدید ہو تو متعدد طرق سے مروی ہونے کے باوجود اس کا ضعف ختم نہیں ہوتا، البتہ جس حدیث کا ضعف خفیف ہو اور دوسری سند سے مروی ہونے کی وجہ سے وہ ضعف دور ہو جاتا ہو تو ایسی صورت میں وہ حدیث قابل احتجاج ہوتی ہے چنانچہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ ''تدریب الراوی''

کے اندر فرماتے ہیں کہ اگر کوئی حدیث کئی طرق سے مروی ہو تو ضروری نہیں کہ اس کے مجموعہ کا حاصل حسن ہو جائے، بلکہ تعدد طرق سے صرف وہی حدیث حسن ہوتی ہے جس کا راوی صدوق و امین ہو اور اس کے حفظ کی کمزوری کی وجہ سے اس میں ضعف آیا ہو جو دوسری سند سے مروی ہونے کی وجہ سے ختم ہو جاتا ہو، اس سے یہ معلوم ہوگا کہ انہوں نے اس حدیث کو یاد رکھا ہے اس میں اس کا حفظ مختل نہیں ہوا ہے، لہذا وہ حدیث حسن ہو جائے گی۔ (تدریب الراوی ۱/۲۲۸۔۲۲۹)

اسی طرح جب ارسال کی وجہ سے ضعف آیا ہو جو دوسری سند سے وارد ہونے کی وجہ سے زائل ہو جاتا ہو تو وہ حدیث حسن ہو جائے گی۔ لیکن اگر راوی کے فسق کی وجہ سے ضعف آیا ہو تو اس وقت دوسرے کی موافقت (کثرت طرق) کچھ بھی اثر نہیں کرے گی (تدریب الراوی ۱/۲۲۶)

اور علامہ سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر راوی کے کذب، شذوذ یا علاوہ ازیں کسی دوسری وجہ سے اس میں شدید ضعف آیا ہو تو اس وقت کثرت طرق سے بھی اس کا ضعف ختم نہ ہوگا (فتح المغیث ۱/۸۲۔۸۳)

مثال کے طور پر چند ایسی احادیث بھی ملاحظہ فرمالیں جو متعدد طرق سے مروی ہیں پھر بھی ان کا ضعف ختم نہیں ہو رہا ہے۔

(۱) جو شخص دین کے احکام سے متعلق چالیس احادیث یاد کرے گا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے فقہاء و علماء کے زمرے میں اٹھائے گا یہ حدیث تیرہ صحابہ کرام سے مروی ہے، اس پر حکم لگاتے ہوئے امام نوویؒ فرماتے ہیں: "اتفق الحفاظ علی انه

حدیث ضعیف و ان کثرت طرقه" محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ کثرت طرق سے مروی ہونے کے باوجود یہ حدیث ضعیف ہے (الاربعین ۳ و مرعاۃ المفاتیح ۱/ ۳۵۰ و مقدمہ تحفۃ الاحوذی ۱/ ۱۰۵)

(۲) شارح مشکوۃ علامہ عبید اللہ مبارکپوری رحمہ اللہ حدیث "ان الوضوء علی من نام "مضطجعاً" (پہلو کے بل سونے والے پر وضوء ضروری ہو جاتا ہے) کے سلسلے میں فرماتے ہیں: ولا ینجبر ضعفه بماله من الطرق والشواهد" کثرت طرق اور شواہد کے ذریعہ بھی اس حدیث کا ضعف ختم نہیں ہو رہا ہے (مرعاۃ المفاتیح ۲۴۱)

(۳) قرآن پڑھ کر مردوں کو اس کا ثواب بخشنے کی ضعیف حدیثوں کے متعلق ملا علی قاری رحمہ اللہ نے علامہ سیوطی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ "یہ احادیث اگر چہ ضعیف ہیں، لیکن ان کا مجموعہ بتا رہا ہے کہ اس کی کچھ اصل ہے" اس پر تعاقب کرتے ہوئے شارح ترمذی علامہ عبد الرحمن مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان کا یہ قول درست نہیں، کیونکہ ان کو غور کرنا چاہئے کہ ان احادیث کا مجموعہ اصل ہونے پر دلالت کرتا ہے یا نہیں؟ کیونکہ متعدد اسانید سے مروی ہر ضعیف حدیث کا مجموعہ اس کی اصل ہونے پر دلالت نہیں کرتا (تحفۃ الاحوذی ۳/ ۳۴۰) اور شارح مشکوۃ علامہ عبید اللہ مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سلسلے میں جتنی احادیث آئی ہیں وہ سب کی سب ضعیف ہیں جو استدلال و احتجاج کے لائق نہیں (مرعاۃ المفاتیح ۵/ ۴۵۳)

(۴) مسجد نبوی کی توسیع کے متعلق حدیث "لو زید فی هذا المسجد ما زید کان الکل مسجدی" پر کلام کرتے ہوئے علامہ عبید اللہ مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: یہ حدیث تمام طرق سے ضعیف ہے جن کا مجموعہ بھی استدلال کے قابل نہیں اور "تمیز الطیب من الخبیث" کے اندر ہے کہ اس کے بہت سارے شواہد ہیں

الگ الگ سند کی بات تو چھوڑ ہی دیجئے اس کے مجموعہ سے بھی دلیل پکڑنا جائز نہیں، اور علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ اس کے طرق کے اندر شدید ضعف ہے لھذا اس پر فضائل اعمال میں بھی عمل نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ علامہ سخاویؒ نے ''المقاصد الحسنۃ'' کے اندر بیان کیا ہے (مرعاۃ المفاتیح ۲/۲۹۸)

(۵) دعاء افطار کی حدیث ''اللھم لک صمت وعلی رزقک افطرت'' کی سند پر کلام کرتے ہوئے علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ سند ضعیف ہے، کیونکہ مرسل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا ایک راوی معاذ مجہول بھی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے ان کو صرف مقبول قرار دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ متابعت کے وقت ان کی حدیث لی جائے گی اور یہاں پر یہ چیز مفقود ہے، کیونکہ اس کی مذکورہ دونوں سندیں ضعیف جداً ہیں جن سے استشہاد جائز نہیں پس معاذ کی یہ حدیث ضعیف ہی رہ جاتی ہے۔ (ارواء الغلیل رقم الحدیث ۹۱۹) اس حدیث پر تفصیلی بحث آگے آرہی ہے انشاء اللہ

تعدد طرق سے کبھی کبھی حدیث کے ضعف کا یقین ہو جاتا ہے۔

اس مسئلہ کی مزید توضیح حافظ ابن صلاحؒ اور علامہ احمد محمد شاکرؒ کی زبانی سنئے چنانچہ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ ''اختصار علوم الحدیث'' کے اندر ابن صلاحؒ سے نقل فرماتے ہیں کہ ضعیف حدیث کا متعدد طرق سے وارد ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ حسن ہی ہو کیونکہ ضعف کے مختلف درجات ہیں بعض ضعف متابعات سے بھی زائل نہیں ہوتا مثلاً کذاب اور متروک راوی کی روایت اور بعض ضعف متابعات سے ختم ہو جاتا ہے جب کہ راوی سئی الحفظ ہو یا حدیث مرسلاً مروی ہو، ایسی صورت میں

متابعات نفع بخش ہو گی اور حدیث حضیض ضعف سے اوج حسن تک پہنچ جائے گی۔

مذکورہ قاعدہ کی تشریح کرتے ہوئے علامہ احمد محمد شاکر فرماتے ہیں کہ اس قاعدہ سے ان متاخرین علماء کی غلطی کھل کر سامنے آجاتی ہے جو مطلقاً یہ کہتے ہیں کہ ''ضعیف حدیث جب متعدد طرق سے مروی ہو تو حسن یا صحیح کے درجہ میں پہنچ جاتی ہے'' کیونکہ اگر حدیث کا ضعف راوی کے فاسق یا متہم بالکذب ہونے کی وجہ سے ہو اور پھر وہ حدیث اسی جیسی متعدد اسانید سے مروی ہو تو اس صورت میں اس کا ضعف مزید پختہ ہو جاتا ہے اس لیے کہ اس وقت یقین ہو جاتا ہے کہ اس حدیث کو کذابین اور مجروحین فی العدالۃ کے علاوہ کسی دوسرے عادل یا ثقہ راوی نے روایت ہی نہیں کیا ہے (الباعث الحثیث بشرح اختصار علوم الحدیث ۳۹)

قارئین کرام! علامہ احمد محمد شاکر رحمہ اللہ کی وضاحت سے معلوم ہو گیا کہ کبھی کبھی کثرت طرق سے حدیث کا ضعف مزید پختہ ہو جاتا ہے اور یقین ہو جاتا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہی ہے۔

ان کے اس موقف کی تائید علامہ زیلعی ، شارح ترمذی علامہ عبدالرحمن مبارکپوری، شارح مشکوۃ علامہ عبیداللہ مبارکپوری اور محدث کبیر علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہم اللہ اور دیگر شارحین و محدثین کے کلام سے بھی ہوتی ہے چنانچہ علامہ زیلعی اپنی کتاب ''نصب الرایہ فی تخریج احادیث الھدایہ'' کے اندر رقم طراز ہیں: بہت سی حدیثیں ایسی ہیں جو کثرت رواۃ اور کثرت طرق سے مروی ہونے کے باوجود ضعیف ہی رہ جاتیں ہیں: مثلاً حدیث الطیر ، حدیث الحاجم والمحجوم اور حدیث من کنت مولاہ فعلی مولاہ کو لیجئے بلکہ کبھی کبھی کثرت طرق سے حدیث کا ضعف مزید بڑھ جاتا ہے (نصب الرایہ ۱؍۳۴۷) اور حدیث ''لامھر اقل من عشرۃ دراھم'' ''دس درہم سے کم مہر متعین کرنا جائز نہیں'' کی

سند پر کلام کرتے ہوئے علامہ عبدالحئی لکھنوی رحمہ اللہ، ''عمدۃ الرعایہ فی حل شرح الوقایہ'' کے اندر اس کے متعدد اسانید بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ سب اسانید مجروح ہونے کی وجہ سے قابل احتجاج نہیں لیکن علامہ عینی رحمہ اللہ نے ''البنایۃ'' کے اندر اس کا یہ جواب دیا ہے کہ جب کوئی حدیث متعدد ضعیف طرق سے مروی ہو تو وہ حسن ہو جاتی ہے اور اس سے احتجاج جائز ہو جاتا ہے اس پر تعاقب کرتے ہوئے شارح ترمذی علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کثرت طرق سے حدیث اس وقت حسن ہوتی ہے جب کہ اس کے طرق کے اندر شدید ضعف نہ ہو اور اگر اس کے طرق کے اندر شدید ضعف ہو یعنی اس کا کوئی بھی طریق کذاب یا متہم بالکذب راوی سے خالی نہ ہو تو اس وقت کثرت طرق کوئی فائدہ نہیں دے گی اور یہاں معاملہ ایسا ہی ہے لہذا یہ حدیث کثرت طرق سے مروی ہونے کے باوجود ضعیف ہی رہ جاتی ہے۔ (مقدمہ تحفۃ الاحوذی ۱/۳۰۸)

دعاء کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیرنے کی احادیث پر کلام کرتے ہوئے علامہ محمد ناصرالدین البانیؒ فرماتے ہیں کہ یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ یہ دونوں حدیثیں اپنے تمام طرق کے ساتھ مل کر ایک دوسرے کو تقویت پہنچا دیتی ہیں، کیونکہ ان کے طرق کے اندر شدید ضعف ہے (ارواء الغلیل حدیث نمبر ۴۳۳-۴۳۴)

اور شارح مشکوۃ علامہ عبیداللہ مبارکپوری رحمہ اللہ حدیث ''من توضأ و ذکر اسم الله علیه کان طهوراً لجمیع بدنه و من توضاء ولم یذکر اسم الله علیه کان طهوراً لاعضاء وضوئه'' (متوضی اگر ابتداء وضوء میں بسم اللہ کہے تو اس کا تمام بدن پاک ہو جاتا ہے اور اگر ابتدائے وضوء میں بسم اللہ نہ پڑھے تو صرف اس کے اعضاء وضوء پاک ہوتا ہے) پر حکم لگاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس کے اندر شدید ضعف ہونے کی وجہ سے یہ حدیث احتجاج کے لائق نہیں اور یہ کہنا بھی درست

نہیں کہ کثرت طرق سے یہ حدیث حسن ہو جاتی ہے کیونکہ کثرت طرق اس وقت سود مند ہوتی ہے جب کہ ان کے اندر معمولی ضعف ہو لیکن اگر ان کے اندر شدید ضعف ہو جیسا کہ اس حدیث کے طرق کے اندر ہے تو اس وقت کثرت طرق سے تقویت حاصل کرنے کے بجائے حدیث مزید ضعیف ہو جاتی ہے۔ (مرعاۃ المفاتیح ۲/۱۰۶)

کثرت طرق سے حدیث کے حسن ہونے کی شرطیں

مذکورہ بیان سے روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا کہ ضعیف حدیث کا کثرت طرق کی بناء پر حسن کے درجہ تک پہنچنے کے شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ اس کے طرق میں سے ہر ایک کے اندر شدید ضعف نہ ہو، اسی طرح ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس حدیث کا مدار کسی ایسے ضعیف ومتروک راوی پر نہ ہو جس کی حدیث سے احتجاج جائز نہیں جیسا کہ حدیث "اذا احدث احدکم وقد جلس فی اخر صلواته قبل ان یسلم فقد جازت صلواته" (تشہد میں بیٹھ کر سلام پھیرنے سے قبل اگر مصلی ہوا خارج کر دے تو اس کی نماز ہو جائے گی) کے متعلق ملا علی قاریؒ فرماتے ہیں کہ اس کے متعدد طرق ہیں جن کو طحاویؒ نے ذکر کیا ہے اور تعدد طرق سے ضعیف حدیث حسن ہو جاتی ہے اس پر تعاقب کرتے ہوئے شارح مشکوٰۃ علامہ عبید اللہ مبارکپوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کسی ضعیف حدیث کو کثرت طرق اس وقت حسن کے درجہ میں پہونچاتی ہیں جبکہ وہ طرق الگ الگ اور متباین ہوں اور ان کا مدار کسی ایک ایسے ضعیف راوی پر نہ ہو جس سے احتجاج جائز نہیں۔ اور اس حدیث کے وہ طرق جنہیں طحاویؒ نے بیان کیا ہے متباین نہیں ہیں۔ بلکہ تمام کا مدار عبد الرحمٰن بن زیاد الافریقی پر ہے اور افریقی مشہور ضعیف راوی ہے جن کی حدیث سے احتجاج جائز نہیں۔ (مرعاۃ المفاتیح ۳/۳۸۷)۔

اسی طرح حدیث "السنة وضع الکف علی الکف فی الصلواۃ تحت السرۃ" (نماز کے اندر سنت یہ ہے کہ ایک ہتھیلی کو دوسری ہتھیلی پر ناف کے نیچے رکھا جائے) پر کلام کرتے ہوئے علامہ شمس الحق عظیم آبادی فرماتے ہیں کہ چند سندوں سے مروی ہونے کے باوجود یہ حدیث ضعیف ہے کیونکہ تمام کا مدار عبدالرحمن بن اسحاق الواسطی پر ہے جو منکر الحدیث اور متروک راوی ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو عون المعبود ۲/۳۲۳)

مذکورہ اصول وضوابط سے انحراف کا نتیجہ

مذکورہ اصول وضوابط اور ان کی توضیحات وتشریحات سے بالکل عیاں ہوجاتا ہے کہ تعدد طرق سے بعض ضعیف احادیث حسن ہو جاتی ہیں، اور بعض ضعیف ہی رہ جاتی ہیں، جب کہ بعض احادیث کے ضعف کا یقین ہو جاتا ہے۔ اس لیے محض تعدد طرق کی بناء پر ہر ضعیف حدیث کو حسن قرار دینا ایک خطرناک غلطی ہے کیونکہ اس سے بہت ساری بدعات کا دروازہ کھل جاتا ہے اور بعض غیر مسنون چیزیں مسنون بن جاتی ہیں چنانچہ اس قسم کی غلطی ایک پمفلٹ میں بھی نظر آئی جو حال ہی میں شائع کیا گیا ہے جس میں فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے سلسلے میں چند ضعیف روایتیں بیان کرنے کے بعد کہا گیا ہے کہ چونکہ یہ روایتیں کئی طرق سے مروی ہیں اس لیے حسن کے درجہ میں آگئی ہیں لیکن تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ان احادیث کے اندر شدید ضعف ہے کیونکہ ان کی سند اور متن دونوں پر کلام ہے جس کی وجہ سے وہ ضعیف کی ضعیف ہی رہ جاتیں ہیں، اس سلسلے میں کل چار احادیث ہیں جن کی تحقیقی جائزہ ہدیہ ناظرین کیا جارہا ہے۔

پہلی حدیث اوراسکا جائزہ:

انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مامن عبد یبسط کفیہ دبر کل صلواۃ، ثم یقول : اللھم الھی والہ ابراھیم واسحاق ویعقوب، والہ جبرائیل ومیکائیل واسرافیل علیھم السلام اسالک ان تستجیب دعوتی فانی مضطر وتعصمنی فی دینی فانی مبتلی، وتنالنی برحمتک فانی مذنب وتنفی عنی الفقر فانی متمسکن الا کان حقاً علی اللہ عزوجل ان لا یرد بہ خائبتین.

ترجمہ: جو بندہ ہر نماز کے بعد اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر اللھم الھی والہ ابراھیم .....کہہ کر دعا کرتا ہے تو اللہ تعالی اس کے ہاتھوں کو نامراد نہیں پھیرتا ہے۔

اس کو ابن السنی نے اپنی کتاب "عمل الیوم واللیلۃ " کے اندر احمد بن ادیبویہ حدثنا ابو یعقوب اسحاق بن خالد بن یزید البالسی ثنا عبد العزیز بن عبدالرحمن القرشی عن خضیف عن انس بن مالک" کی سند سے مرفوعاً روایت کیا ہے ۔ نیز علامہ سیوطی نے " الجامع الکبیر " کے اندر ابوالشیخ ، دیلمی، ابن عساکر اور ابن النجاری کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ علاوہ ازیں اسے فتاوی نذیریہ، تحفۃ الاحوذی، صلوٰۃ الرسول ، کنز العمال اور سنیۃ رفع الیدین فی الدعاء بعد الصلوات المکتوبۃ وغیرہ کے اندر دیکھی جاسکتی ہے۔

علامہ سیوطی اور علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث واہی اور انتہائی ضعیف ہے (سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ والموضوعۃ حدیث نمبر ۱۰۷۵)

اس کے اندر درج ذیل علتیں پائی جاتی ہیں۔

(۱) اس کا ایک راوی خصیف متکلم فیہ ہے، حافظ ابن حجر عسقلانیؒ "تقریب التہذیب" کے اندر فرماتے ہیں کہ "صدوق سیئی الحفظ خلط بأخره" یہ صدوق لیکن سیئی الحفظ راوی ہے، آخری عمر میں ان کا حافظہ خراب ہو گیا تھا۔
(تقریب التہذیب ۱۹۳)

امام احمدؒ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے جب کہ امام ابن معینؒ اور ابوزرعہؒ نے اسے ثقہ کہا ہے (عون المعبود ۳/۲۳۸)

(۲) اس کا دوسرا راوی عبدالعزیز بن عبدالرحمٰن القرشی متہم بالکذب اور غیر ثقہ ہیں چنانچہ امام ذہبیؒ "میزان الاعتدال" کے اندر فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ نے اسے متہم قرار دیا ہے اور امام نسائیؒ نے اسے غیر ثقہ قرار دیا ہے امام احمدؒ نے ان سے حدیث لینا چھوڑ دیا تھا۔
(میزان الاعتدال ۲/۳۶۷)

(۳) اس کا تیسرا راوی اسحاق بن خالد بن یزید البالسی ضعیف ہیں: ان کے بارے میں امام ابن عدیؒ فرماتے ہیں: "روی غیر حدیث منکر عن جماعة من الشیوخ ورو ایاته تدل بانه ضعیف" انہوں نے ایک جماعت اساتذہ سے بہت ساری منکر حدیثیں روایت کی ہے اور ان کی روایات ہی بتا رہی ہے کہ وہ ضعیف راوی ہیں (سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ حدیث نمبر ۱۰۵۷)

(۴) چوتھی علت انقطاع ہے خصیف نے اس حدیث کو انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے لیکن انس رضی اللہ عنہ سے انکا سماع ثابت نہیں ہے اس اعتبار سے یہ حدیث منقطع ہو رہی ہے۔ (تہذیب التہذیب ۲/۸۹۔۹۰) لہٰذا یہ حدیث قابل حجت نہیں اور یہ واہی اور مکذوب ہونے کی وجہ سے اس کے اندر کسی حدیث کو تقویت پہنچانے کی بھی صلاحیت نہیں ہے۔

دوسری حدیث اور اس کا جائزہ

عن الاسود العامری عن ابیه قال: صلیت مع رسول الله صلی الله علیه وسلم الفجر فلما سلم انحرف ورفع یدیه و دعا.... الحدیث.

ترجمہ: اسود عامری اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ فجر کی نماز پڑھی جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا تو مقتدیوں کی طرف منہ موڑ لیا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔

اس روایت کو انہیں لفظوں کے ساتھ عبدالوہاب مہیہ جزائری نے "کشف الأکنه" کے اندر، علامہ سیوطی نے "فض الوعاء" کے اندر، مولانا محمد صادق سیالکوٹی نے "صلوۃ الرسول" کے اندر، مفتی جمیل احمد نذیری نے "رسول اکرم ﷺ کا طریقہ نماز" کے اندر، شیخ محی الدین نے "البلاغ المبین" کے اندر بیان کیا ہے اسی طرح اسے اعلاء السنن، فتاوی نذیریہ میں تین جگہوں پر، فتاوی ثنائیہ میں اور شیخ عبداللہ غماری نے بھی نقل کیا ہے، اور مذکورہ تمام ناقلین نے "مصنف ابن ابی شیبہ" کے حوالہ سے بغیر سند کے ذکر کیا ہے۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ "مصنف ابن ابی شیبہ" میں "رفع یدیه و دعا" (آپ ﷺ نے دونوں ہاتھ اٹھایا اور دعا کی) کا لفظ نہیں ہے۔

اس حدیث کے متعلق علامہ عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ فرماتے ہیں کہ "کذا ذکرہ بعض الاعلام هذا الحدیث بغیر سند وعزاہ الی المصنف، ولم اقف علی سندہ فالله تعالی اعلم کیف هو صحیح او ضعیف؟" بعض علماء نے اس حدیث کو اسی طرح بغیر سند کے بیان کیا ہے اور مصنف ابن ابی شیبہ کی طرف منسوب کیا ہے، مگر مجھے اس کی سند نہیں ملی لہذا اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ حدیث کیسی ہے؟

صحیح ہے یا ضعیف؟(تحفة الاحوذی کتاب الصلوة باب مایقول اذا سلم)

اور شارح مشکوۃ علامہ عبید اللہ مبارکپوری فرماتے ہیں: مصنف لابن ابی شیبہ مطبوعہ الدار السلفیہ بھی مکمل موجود ہے۔ اس حدیث کے ذکر کے لیے دو مقام اور محل مناسب ہیں ایک "باب الانحراف بعد السلام" اور دوسرا "باب الدعاء برفع الیدین بعد السلام" مگر دونوں جگہ یہ حدیث اس سند اور لفظ کے ساتھ موجود نہیں اور نہ اس بات کا اطمینان ہے کہ مذکورہ سند و الفاظ محفوظ ہونگے۔

مصنف ابن ابی شیبہ "باب من کان یستحب اذا سلم ان یقوم او ینحرف" اور "باب یصلی فی بیته ثم یدرک جماعة" میں صحیح سند کے ساتھ یہ حدیث اس طرح مروی ہے۔

عن جابر بن یزید الاسود العامری عن ابیه قال: صلیت مع رسول الله صلی لله علیه وسلم فلما سلم انحرف"، یہ حدیث مختصراً و مطولاً متعدد کتب حدیث میں مروی ہے مگر کسی میں بھی "رفع یدیہ و دعا" (ہاتھ اٹھایا اور دعا کی) کا لفظ نہیں ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو محدث بنارس جون ۱۹۸۲ء ص:۲۵۔۲۸)

اسی طرح علامہ البانی سلسلة الاحادیث الضعیفة والموضوعة حدیث نمبر (۱۰۷۵) کے تحت شیخ عبداللہ غماری کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں: فقوله: "رفع یدیه و دعا" فان هذه الزیاده لا اصل لها فی "المصنف" ولا عند غیره ممن اخرج الحدیث، وانما هی مما املاه علیه هواه . والعیاذ بالله تعالی . فالحدیث فی موضعین من "المصنف" باسناد واحد ......

یعنی "رفع یدیه و دعا" کی زیادتی نہ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے اور نہ ہی حدیث کی ان کتابوں کے اندر ہے جن میں اسے روایت کی گئی ہے اسے تو شیخ عبداللہ

غماری کی خواہشات نے لکھوائی ہے۔ اللہ کی پناہ۔ کیونکہ یہ حدیث ''مصنف ابن ابی شیبہ'' کے اندر دو جگہوں پر ایک ہی سند سے مروی ہے لیکن کسی میں بھی ''رفع یدیہ ودعا'' کا لفظ نہیں ہے۔

(تفصیل کے لیے ''الضعیفۃ'' ۵۷۰۱ کی طرف مراجعہ مفید ہوگی)

اسی طرح فضیلۃ الشیخ عزیز الرحمٰن سلفی استاد جامعہ سلفیہ بنارس حفظہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے خود اس حدیث کو ''مصنف ابن ابی شیبہ'' میں بہت تلاش کیا مگر تلاش بسیار کے باوجود مجھے یہ حدیث نہیں مل سکی (دعاء کے آداب واحکام ۹۶) لہٰذا جب تک محولہ کتاب میں ''رفع یدیہ ودعا'' کا لفظ نہیں مل جاتا ہے تب تک اس حدیث سے دلیل پکڑنا اور فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کے متعلق کسی بھی حدیث کے شاہد کے طور پر اسے پیش کرنا درست نہیں۔

تیسری حدیث اور اس کا جائزہ

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام پھیرنے کے بعد قبلہ رخ بیٹھے ہاتھ اٹھا کر یہ دعا کی ''اللھم خلص الولید بن الولید وعیاش بن ابی ربیعہ وسلمۃ بن ھشام وضعفۃ المسلمین الذین لا یستطیعون حیلۃ ولا یھتدون سبیلاً۔''

یہ حدیث تفسیر ابن جریر، تفسیر ابن کثیر، تحفۃ الاحوذی، فتاوی ثنائیہ، فتاوی نذیریہ، معارف السنن اور الاذکار المسنونہ بعد الصلوۃ المکتوبۃ وغیرہ کتابوں میں ہے۔

یہ حدیث منکر ہے محدث کبیر علامہ محمد ناصر الدین البانیؒ نے اسے منکر قرار دیا ہے (سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ والموضوعہ حدیث نمبر ۶۶۳۰) اس کی نکارت معلوم کرنے کے لیے سند ملاحظہ ہو۔

(۱)قال ابن ابی حاتم حدثنا ابو معمر المقری، حدثنی عبدالوارث حدثنا علی بن زید عن سعید بن المسیب عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رفع یدیہ بعد ما سلم و ھو مستقبل القبلہ فقال اللھم... الخ

(۲)وقال ابن جریر، حدثنا المثنی حدثنا حجاج حدثنا حماد عن علی بن زید عن عبداللہ او ابراھیم بن عبداللہ القرشی عن ابی ھریرہ ..الخ (تفسیر ابن کثیر ۷۲۱/۱)

ذرا غور کیجئے! دونوں سندوں میں علی بن زید بن جدعان ہیں جو مشہور ضعیف راوی ہیں (تقریب التھذیب ۴۰۱ وتھذیب التھذیب ۱۹۴/۴ – ۱۹۶ والاباطیل والمناکیر ۳۲۸/۱ و ۹۳/۲)

اور عبدالوارث کے مطابق انہوں نے اس حدیث کو سعید بن المسیب عن ابی ہریرہ سے روایت کرتے ہوئے یوں بیان کیا کہ آپ ﷺ نے مذکورہ دعا نماز سے سلام پھیرنے کے بعد کی تھی لیکن صحیح بخاری "کتاب التفسیر، باب قولہ تعالی لیس لک من الامر شئی" اور "کتاب الادب، باب تسمیۃ الولید" کے اندر سعید بن مسیّب عن ابی ہریرہؓ ہی کی سند سے ایک ثقہ اور حافظ راوی امام زہری نے اس کو روایت کیا ہے جس میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ رکوع کے بعد قنوت نازلہ میں یہ دعا مانگا کرتے تھے، ذرا صحیح بخاری "کتاب الادب، باب تسمیۃ الولید" کی سند مع متن ملاحظہ فرمالیں، قال البخاری حدثنا ابو نعیم الفضل بن دکین قال حدثنا ابن عیینۃ عن الزھری عن سعید بن المسیب عن ابی ھریرہ قال: لما رفع النبی صلی اللہ علیہ وسلم من الرکعۃ قال: اللھم انج الولید وسلمۃ بن ھشام وعیاش بن ابی ربیعۃ والمستضعفین

بمكة من المومنين اللهم اشدد وطاتک علی مضر اللهم اجعلها سنين كسني يوسف.

اس حدیث کو سعید بن مسیّب کے علاوہ دیگر کئی ثقات مثلاً عبدالرحمٰن بن ہرمز الاعرج، ابوسلمۃ بن عبدالرحمٰن اور ابوبکر بن عبدالرحمٰن نے بھی روایت کیا ہے۔ ان روایتوں میں بھی اس کو بعد الرکوع ہی پڑھنے کا ذکر ہے۔ یہ روایتیں صحیح بخاری کے اندر حدیث نمبر ۸۰۴، ۱۰۰۶، ۲۹۳۲، ۴۵۹۸، ۶۲۹۳، اور ۶۹۴۰ کے تحت دیکھی جاسکتی ہیں۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ اس کو ضعیف راوی علی بن زید نے ثقہ راوی زہری کے خلاف روایت کیا ہے اور ضعیف راوی اگر ثقہ راوی کے خلاف روایت کرے تو اس کو منکر کہتے ہیں اور منکر حدیث ضعیف جداً ہوتی ہے۔ (تیسیر مصطلح الحدیث ۹۶۔۹۷)

پھر یہ حدیث ایک اور اعتبار سے صحیح احادیث کے خلاف ہے کیونکہ متعدد صحیح احادیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سلام پھیرنے کے بعد دائیں یا بائیں طرف مڑ کر مقتدی کی جانب رخ کر لیتے تھے اور اس ضعیف حدیث میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ بعد السلام قبلہ رخ ہو کر بیٹھے رہے۔

اس حدیث کے اندر ایک علت یہ بھی ہے کہ علی بن زید نے اس کو کس استاذ سے سنا ہے اس کی تعیین میں وہ متردد تھا عبدالوارث کے مطابق انہوں نے سعید بن مسیّب کو اپنا استاد قرار دیا ہے جبکہ حماد کے مطابق انہوں نے اپنے استاد کا نام یوں بیان کیا: عبداللہ او ابراہیم بن عبداللہ القرشی عن ابی ہریرہ جیسا کہ ماقبل میں تفسیر ابن کثیر ۱/۴۲۱ کے حوالہ سے گذرا۔

ذرا غور کیجئے! کہ اگر ان کو یہی یاد نہ ہو کہ انہوں نے اس حدیث کو کس استاد سے سنا ہے تو وہ حدیث کے الفاظ کیسے یاد رکھیں گے؟

دوسری بات ہے کہ اگر عبداللہ یا ابراہیم بن عبداللہ القرشی کو ثقہ مان بھی لیا جائے

تب بھی یہ حدیث ضعیف جداً ہو رہی ہے کیونکہ عبداللہ یا ابراہیم نے اس حدیث کو ثقات (ابوسلمہ، اعرج اور ابوبکر بن عبدالرحمن) کے خلاف روایت کیا ہے، اور ثقہ راوی اگر اوثق یا ثقات کے خلاف روایت کرے تو اس کو شاذ کہتے ہیں اور پھر شاذ ہونے کے ساتھ ساتھ سند میں علی بن زید بن جدعان کی موجودگی حدیث کو ضعیف جداً کی گہرائی میں دھکیل دیتی ہے۔ لھذا اس سے استدلال کرنا جائز نہیں اور ضعیف جدا ہونے کی وجہ سے اس کے اندر کسی حدیث کو تقویت پہونچانے کی صلاحیت نہیں ہے اس لیے کسی حدیث کے شاہد کے طور پر اسے پیش کرنا درست نہیں۔

چوتھی حدیث اور اس کا جائزہ

امام طبرانیؒ فرماتے ہیں: حدثنا سليمان بن الحسن العطار قال: حدثنا ابو كامل الجحدری، قال حدثنا الفضيل بن سليمان قال حدثنا محمد بن ابی يحی قال رائت عبدالله بن الزبير ورای رجلاً رافعاً يديه يدعو قبل ان يفرغ من صلاته، فلما فرغ منها قال: ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لم يكن يرفع يديه حتى يفرغ من صلاته.

محمد بن ابی یحی اسلمی فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن زبیر نے ایک آدمی کو سلام پھیرنے سے پہلے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہوئے دیکھ کر فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہونے کے بعد ہی ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے تھے۔

(المعجم الكبير للطبرانی قطعة من مسانيد من اسمه "عبد الله" تحقيق ابو معاذ طارق بن عوض الله)

اس حدیث پر حکم لگاتے ہوئے علامہ ہیثمیؒ نے "مجمع الزوائد" کے اندر اور ان کی اتباع کرتے ہوئے علامہ سیوطیؒ نے "فص الوعاء" کے اندر رجالہ ثقات (اس کے

سب راوی ثقہ ہیں) فرمایا ہے لیکن علامہ ہیثمی تصحیح حدیث میں متساہل ہیں، ان کی تصحیح کا محدثین کے نزدیک کچھ بھی اعتبار نہیں، محدث کبیر علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے "سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ والموضوعہ" کے اندر اسی طرح دوسرے محققین نے اپنے اپنے تصنیفات کے اندر بہت سارے مقامات میں ان کی تصحیح پر تعاقب کرتے ہوئے ان کو تصحیح حدیث میں متساہل گردانا ہے۔ چنانچہ شارح مشکوۃ علامہ عبید اللہ مبارکپوری رحمۃ اللہ اپنی کتاب "مرعاۃ المفاتیح" کے ایک مقام پر علامہ ہیثمیؒ کے متعلق فرماتے ہیں:۔

ورواية الطبراني وان صحح الهيثمي اسنادها لكن لا يطمئن القلب بتصحيحه ، لان له اوهاما في كتابه على ان صحة السند لا يستلزم صحة المتن. (مرعاة المفاتيح ۳/ ۴۶ باب صفة الصلوة ،الفصل الاول) اور رہی طبرانی کی روایت تو علامہ ہیثمی نے اگرچہ اس کی سند کو صحیح گردانا ہے، لیکن ان کی تصحیح سے دل مطمئن نہیں ہوتا، کیونکہ ان کی کتاب میں ان سے بہت سے اغلاط ہو گئے ہیں، نیز سند کی صحت سے متن کا صحیح ہونا لازم نہیں آتا

لہٰذا محققین کے فیصلہ کو پیش نظر رکھ کر ناظرین کرام خود فیصلہ کریں کہ علامہ ہیثمیؒ کا "رجالہ ثقات" کہنے کی حقیقت کیا ہے؟

علامہ ہیثمیؒ کے علاوہ اس حدیث کے بارے میں علامہ سیوطیؒ نے بھی "رجالہ ثقات" فرمایا ہے لیکن علامہ سیوطیؒ بھی تصحیح احادیث کے سلسلے میں متساہل ہیں، چنانچہ صاحب "عون المعبود" علامہ شمس الحق عظیم آبادیؒ ان کے بارے میں "کتاب السنة ، باب في ذراري المشركين" کے تحت فرماتے ہیں! العلامة السيوطي متساهل جداً لا عبرة بكلامه في هذا الباب مالم يوافقه الائمة النقاد" (عون المعبود ۱۲/ ۳۲۴)

علامہ سیوطیؒ بہت متساہل ہیں، اس بارے میں جب تک ائمہ نقادان کی موافقت نہ کریں تب تک ان کے کلام کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائیگا۔

اصول حدیث سے واقفیت رکھنے والے حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ راوی کے ثقہ ہونے سے سند کا اتصال ثابت نہیں ہوتا اور نہ ہی حدیث کا ضعف ختم ہوتا ہے کیونکہ منقطع، مرسل، معضل اور مضطرب وغیرہ کے رواۃ بھی بسا اوقات ثقہ ہوتے ہیں، نیز راوی اور سند کے صحیح ہونے کے باوجود متن شاذ اور معلل ہوسکتی ہے۔

قارئین کرام! مذکورہ دونوں اماموں کے "ورجالہ ثقات" کہنے کی حقیقت کیا ہے ؟ ذرا ملاحظہ فرمالیں۔

اولاً: تابعی محمد بن ابی یحیی اسلمی متکلم فیہ ہیں۔ امام ابوحاتم رازیؒ کا بیان ہے کہ یحیی بن سعید القطانؒ نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے اور امام ابن شاہینؒ نے ان کے بارے میں "فیہ لین" (ان کے اندر ضعف ہے) فرمایا ہے۔ (بذل المجهود ۲۲۱/۴)
حافظ ذہبیؒ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔ (میزان الاعتدال ۳۶۸/۶)

ثانیاً: تابعی محمد بن ابی یحیی اسلمی سے روایت کرنے والے فضیل بن سلیمان ضعیف ہیں، چنانچہ طبرانی کبیر کے اس جزء کے محقق ابو معاذ طارق بن عوض اللہ ان کے بارے میں رقم طراز ہیں، "**فضیل بن سلیمان هو النمیری، ضعیف، فلاادری ما معنی قول الهیثمی (۱۶۹/۱۰) رجاله ثقات**"؟ فضیل بن سلیمان یہ نمیری ہیں جو ضعیف ہیں پس معلوم نہیں علامہ ہیثمیؒ کا قول "**رجاله ثقات**" کا مطلب کیا ہے؟

اور حافظ ذہبیؒ فرماتے ہیں کہ یہ کتب ستہ کے رواۃ میں سے ہیں، جو صدوق ہیں، اور امام ابوحاتم رازیؒ فرماتے ہیں کہ وہ قوی نہیں ہیں امام ابن معینؒ کہتے ہیں کہ وہ ثقہ نہیں ہیں۔ اور امام ابو زرعہؒ نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے (میزان الاعتدال

۵/۴۳۸-۴۳۹)

امام ابن معین فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ نہیں ہیں، امام ابو زرعہ کہتے ہیں وہ لین الحدیث ہیں، امام ابو حاتم رازی فرماتے ہیں کہ ان کی حدیث لکھی جائیگی لیکن وہ قوی نہیں ہیں، آجری نے امام ابو داوٗد سے نقل کیا ہے کہ امام عبدالرحمٰن بن مہدی ان سے حدیث نہیں لیتے تھے، امام ابو داوٗد فرماتے ہیں کہ فضیل بن سلیمان اور سمتی دونوں موسیٰ بن عقبہ کے پاس گئے اور مطالعہ کے لیے ان سے ایک کتاب مستعار لی پھر واپس نہیں کیے، فرماتے ہیں کہ وہ قوی نہیں ہیں، امام ابن حبان نے ان کو ثقات کے اندر داخل کیا ہے، صالح بن جزرہ فرماتے ہیں کہ وہ منکر الحدیث ہیں، امام ساجی نے ابن معین سے نقل کیا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں ہیں، ان کی حدیث نہیں لکھی جائے گی۔ امام ساجی فرماتے ہیں کہ وہ صدوق ہیں لیکن منکر حدیثیں روایت کرتے تھے اور ابن قانع فرماتے ہیں کہ وہ ضعیف ہیں (تہذیب التہذیب ۴/۲۸۱)

واضح رہے کہ زیر بحث راوی کتب ستہ کے رواۃ میں سے ہونے کی وجہ سے "ضعیف جداً" نہیں ہے بلکہ متابعت کے وقت قابل قبول ہے، اور یہاں پر ان کا متابع نہیں ہے اس لیے یہ حدیث ضعیف کی ضعیف ہی رہ جاتی ہے۔

ثالثاً: امام طبرانی کے استاد سلیمان بن الحسن العطار مجہول ہیں۔ چنانچہ علامہ البانی رحمۃ اللہ علیہ "سلسلۃ الاحادیث الضعیفہ والموضوعہ" حدیث نمبر (۶۶۳۰) کے تحت علامہ ہیثمی اور علامہ سیوطی کے اس حدیث پر حکم لگاتے ہوئے "رجالہ ثقات" کہنے پر تعاقب کرتے ہوئے فرماتے ہیں، "الحدیث لا یثبت و توثیق رجاله فيه تساهل يتبين لمن وقف على اسناده.

یہ حدیث ثابت نہیں ہے اور اس کے راویوں کو ثقہ قرار دینا یہ تساہل ہے جس کو اس حدیث کی سند حاصل ہو جائے وہ یہ بات آسانی سے معلوم کر سکتا ہے۔

پھر آں رحمہ اللہ اس کی سند بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اس میں دو علتیں پائی جاتی ہیں ایک فضیل بن سلیمان ..... والعلة الاخرى: شيخ الطبراني (سليمان بن الحسن العطار) لا يدرى حاله ولم يرو له الطبراني في الاوسط (۳۸۹/۴۔۳۹۱) الا اربعة احاديث فهو من شيوخه المغمورين، ولم اجد له ترجمة ولا في "بلغة القاصي والداني في تراجم شيوخ الطبراني" للشيخ حماد الانصاري، والشيخ الهيثمي كثيراً ما يغض النظر عن شيوخ الطبراني ويقول كما هنا "رجاله ثقات" او "رجاله رجال الصحيح" وهو تساهل عرف به، فينبغي التنبيه لهذا.

اور دوسری علت امام طبرانی ؒ کے شیخ سلیمان بن الحسن العطار کا مجہول ہونا ہے کیونکہ ان کی حالات معلوم نہیں اور امام طبرانیؒ نے اپنی کتاب "الاوسط" (۳۸۹/۴۔ ۳۹۱) کے اندر ان کی صرف چار حدیثیں بیان کی ہے پس وہ امام طبرانی ؒ کے مجہول شیوخ میں سے ہیں، میں نے ان کا ترجمہ کسی کتاب میں نہیں پایا اور نہ ہی شیخ حماد انصاری کی کتاب "بلغة القاصي والداني في تراجم شيوخ الطبراني" میں پایا۔ اور شیخ ہیثمی بسا اوقات امام طبرانی ؒ کے اساتذہ سے آنکھ بند کر لیتے ہیں اور "رجاله ثقات" یا "رجاله رجال الصحيح" کہہ کر حکم لگا دیتے ہیں جیسا کہ اس حدیث پر "رجاله ثقات" کہہ کر حکم لگا چکے ہیں علامہ ہیثمی کا یہ تساہل مشہور و معروف ہے اس پر واقف ہونا ضروری ہے۔

رابعاً: عبداللہ بن زبیر کی یہ حدیث ضعیف ہونے کی ساتھ ساتھ صحیح احادیث کے خلاف بھی ہے کیونکہ اس حدیث میں نماز کے اندر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے سے منع کیا گیا ہے۔ جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نماز کے اندر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا

احادیث صحیحہ کثیرہ سے ثابت ہے مثلاً قنوت نازلہ میں (صحیحین) اور صلواۃ کسوف میں (صحیح مسلم ۱/۱۹۹) نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ابوبکر رضی اللہ عنہ نے نماز کے اندر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی ہے۔ (صحیح بخاری ۱/۹۴)

لہٰذا عبداللہ بن زبیر کی مذکورہ حدیث صحیحین کی احادیث کے خلاف ہونے کی وجہ سے مردود و مرجوح قرار پاتی ہے اور اس پر سنداً ومتناً دونوں اعتبار سے کلام ہونے کی وجہ سے ضعیف جداً ہو جاتی ہے، جس سے احتجاج جائز نہیں اس لیے اس کو فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کے متعلق کسی حدیث کے شاہد کے طور پر پیش کرنا صحیح نہیں ہے۔

معزز قارئین! آپ نے دیکھ لیا کہ مذکورہ احادیث کے اندر شدید ضعف ہے جس کی وجہ سے اس لائق نہیں کہ ان کا مجموعہ حسن کے درجہ میں پہنچ جائے۔ لہٰذا جو لوگ کہتے ہیں کہ تعدد طرق کی وجہ سے یہ احادیث حسن کے درجہ میں آ گئی ہیں ان لوگوں کو محدثین واصولیین کے مذکورہ قواعد وضوابط اور پھر ان احادیث کے اسانید ومتون پر غور کرنا چاہیے کہ آیا یہ احتجاج کے لائق ہے بھی یا نہیں؟ اگر نہیں، تو ان سے احتجاج کرتے ہوئے فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کو سنت یا مستحب یا جائز قرار دینا غلط اور محدثین واصولیین کے قواعد کے خلاف ہے اس لیے پمفلٹ چھاپنے والوں کو اپنے نظریہ پر نظر ثانی کرنی چاہیے کہ ان کا یہ موقف کہاں تک درست ہے؟۔

☆☆☆

فضائل اعمال کا بہانا

اب تک مختلف زبانوں میں ضعیف احادیث کے سلسلے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے پھر بھی اس دور کے بعض علماء اس نظریہ کے حامل ہیں کہ فضائل اعمال یا ترغیب و ترہیب میں آنکھ بند کر کے ضعیف حدیث پر عمل کرنا جائز ہی نہیں بلکہ مستحب ہے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اس پر عمل کرنا جائز نہیں تو فوراً جواب دیتے ہیں کہ فضائل میں ضعیف حدیث پر عمل کرنا جائز ہے۔ حالانکہ بہت سی حدیثیں ایسی ہوتی ہیں جن کا فضائل سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا ہے پھر بھی ان پر فضائل کا لبادہ ڈال کر عمل کیا جا رہا ہے۔ مثلاً اجابت مقیم کی حدیث جس کو امام ابو داؤد نے اپنی "سنن" کے اندر روایت کیا ہے اسی طرح چودھویں اور اکیسویں دن عقیقہ کرنے کی مرفوع حدیث جیسے امام بیہقیؒ اور امام طبرانیؒ نے روایت کیا ہے۔ اور اسی سے متعلق عائشہ رضی اللہ عنہا کی موقوف حدیث جیسے امام حاکمؒ نے "مستدرک" کے اندر روایت کرنے کے بعد اسے صحیح قرار دیا ہے اور امام ذہبیؒ نے ان کی موافقت کی ہے۔ لیکن علامہ محمد ناصر الدین البانیؒ نے اسے معلول کہا ہے۔ اسی طرح بڑے ہو کر خود اپنا عقیقہ کرنے کی حدیث جیسے امام بزارؒ، امام طبرانیؒ اور امام عبد الرزاقؒ نے انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، اسی طرح میت کو دفناتے وقت مٹی ڈالتے ہوئے "منها خلقناكم .... پڑھنے کی حدیث اسی طرح کھجور کے کٹھلیوں یا کنکریوں کے ذریعہ تسبیح گنتے کے سلسلے میں سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث جسے امام ابو داؤد نے "سنن" کے اندر، امام ترمذی نے اپنی "جامع" کے اندر، امام نسائی نے "عمل اليوم والليلة" کے اندر اور امام حاکم نے "مستدرک" کے اندر روایت

کیا ہے اور علامہ عبید اللہ مبارکپوریؒ اور علامہ محمد ناصر الدین البانیؒ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ نیز اسی سے متعلق صفیہ رضی اللہ عنہا کی حدیث جیسے امام ترمذی نے ''جامع'' کے اندر اور امام حاکمؒ نے ''مستدرک'' کے اندر روایت کیا اور خود امام ترمذیؒ اور علامہ محمد ناصر الدین البانیؒ نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

مذکورہ حدیثوں کے علاوہ بہت ساری حدیثیں جو ضعیف ہیں اور ان کا فضائل سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ ان پر فضائل کا لیبل لگا کر عمل کرنے والے عمل کرتے آرہے ہیں اور دریافت کرنے پر جواب دیتے ہیں کہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل کرنا جائز ہے۔ حتی کہ بعض نے ''منہا خلقناکم ....والی حدیث کے سلسلے میں اپنے فتوی میں بھی لکھ ڈالا کہ یہ حدیث فضائل کے سلسلے میں ہے جس پر عمل کرنا جائز ہے۔

☆☆☆

ضعیف حدیث بیان کرنے کا حکم

وعظ و نصیحت، ترغیب و ترہیب اور قصے وغیرہ میں ضعیف حدیث بیان کرنا جائز ہے۔ اگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بیان کر دیا جائے کہ یہ حدیث ضعیف ہے اس پر عمل کرنا جائز نہیں تا کہ عوام اس پر عمل نہ کرنے لگیں، یاد رہے کہ یہ حکم اس وقت ہے جبکہ اس حدیث کا تعلق عقائد اور احکام سے نہ ہو، اگر اس کا تعلق عقائد و احکام سے ہو تو اس کو عوام کے سامنے بیان کرنا جائز نہیں۔

اس سلسلے میں امام مسلمؒ اپنی ''صحیح'' کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں کہ صحیح اور ضعیف حدیثوں کے درمیان تمیز کرنا ہر ایک کے لیے واجب ہے اور ثقہ و متہم راویوں کے درمیان فرق کرنا ہر ایک کے لیے ضروری ہے اور صرف اسی حدیث کو روایت کرے جس کی صحت کی جان کاری ہو، اور جس کے رواۃ کا ثقہ ہونا معلوم ہو اور متہمین و معاندین یعنی بدعتیوں سے مروی احادیث لینے سے اجتناب ضروری ہے۔ (مقدمہ صحیح مسلم ۶/۱)

نیز موصوف اپنے مقدمہ کے (ص۔۲۰) پر لکھتے ہیں کہ ضعیف حدیث خواہ اس کا تعلق عقائد سے ہو یا احکام سے یا فضائل اعمال سے اسکا ضعف معلوم ہونے کے باوجود اگر کوئی اسے عوام کے سامنے بیان کرتا ہے اور اس کے ضعف کی صراحت نہیں کرتا ہے تو وہ ''کان اثماً بفعله ذلک غاشاً لعوام المسلمین'' ایسا کرنے کی وجہ سے وہ گناہ گار اور عوام کو دھوکا دینے والا ہوگا نیز موصوف آگے چل کر فرماتے ہیں کہ جو عالم ضعیف حدیث عوام کے سامنے بیان کرتے ہیں اور جان بوجھ کر اس کے ضعف کی صراحت نہیں کرتے ہیں ان کا علم دین میں کوئی حصہ نہیں ہے اور اس کو عالم

کہنے کے بجائے جاہل کہنا ہی زیادہ بہتر ہے (مقدمہ صحیح مسلم ۱/۲۰)

لہٰذا ضعیف حدیث کا تعلق خواہ فضائل اعمال سے ہی کیوں نہ ہو اس کے ضعف کی صراحت کیے بغیر اسے عوام کے سامنے بیان کرنا جائز نہیں اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ گنہگار ہوگا جیسا کہ امام مسلمؒ نے پر زور الفاظ میں اسکی صراحت کر دی۔ مذکورہ باتوں کو امام موصوف نے اپنی ''صحیح'' کے مقدمہ میں کتاب وسنت کے دلائل سے ثابت کیا ہے اس لیے اس سلسلے میں مقدمہ صحیح مسلم کی طرف مراجعت مفید ہوگی۔

☆☆☆

کیا فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل کرنا جائز ہے؟

عقائد اور احکام و مسائل میں کسی بھی حالت میں ضعیف حدیث پر عمل کرنا جائز نہیں، اس میں سب کا اتفاق ہے، البتہ فضائل اعمال یا ترغیب و ترہیب میں ضعیف حدیث پر عمل کرنے کے سلسلے میں علماء کرام کا اختلاف ہے جو درج ذیل ہے،

(۱) فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل کرنا جائز اور مستحب ہے، یہ قول ابو الحسن قطان کا ہے، ملاحظہ ہوان کی کتاب "الوہم والایہام" نیز یہ قول ابن الہمام حنفی کا ہے، دیکھئے ان کی کتاب "فتح القدیر" کا کتاب الجنائز، مذکورہ قول امام نووی کا بھی ہے انھوں نے یہ قول اپنی کتاب "الاذکار" اور "الاربعین" میں بیان کیا ہے۔

ان حضرات کے پاس قرآن واحادیث صحیحہ سے کوئی دلیل نہیں ہے۔ لھذا اس زمانہ میں جو لوگ کہتے ہیں کہ فضائل اعمال یا ترغیب و ترہیب میں ضعیف حدیث پر عمل کرنا جائز یا مستحب ہے ان کے پاس صرف ابو الحسن قطان، ابن الھمام حنفی اور امام نووی رحمہم اللہ کا قول ہے اس کے علاوہ قرآن و صحیح حدیث کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

(۲) دوسرا مسلک جمہور کا ہے ان کے نزدیک فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل کرنے کے لیے تین شرطیں ہیں، تینوں شرائط بیک وقت جب کسی ضعیف حدیث کے اندر پائی جائیں تب اس پر عمل کرنا جائز ہے ورنہ نہیں، وہ شرائط یہ ہیں:

(۱) اس حدیث کے اندر شدید ضعف نہ ہو، یعنی اسکی سند میں کذاب، متہم بالکذب، متروک، فحش غلطی کرنے والا اور مجہول الحال راوی نہ ہو

(۲) وہ حدیث کسی عام معمول بہ قاعدہ کے تحت مندرج ہو۔

(۳) اس حدیث پر عمل کرتے وقت اس بات کا اعتقاد نہ رکھے کہ یہ حدیث رسول اللہ اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، بلکہ اس سے بچنے اور پرہیز کرنے کا اعتقاد رکھے تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی ایسا قول یا فعل منسوب نہ ہو جو آپ ﷺ نے نہ فرمایا ہے اور نہ کیا ہے مذکورہ شرائط مندرجہ ذیل کتابوں میں ملے گی۔

(۱) القول البدیع فی الصلوٰۃ علی الحبیب الشفیع (۲) تیسیر مصطلح الحدیث (ص ۶۵۔۶۶) (۳) فتح المغیث للسخاوی (۱/۲۶۸) (۴) تدریب الراوی للسیوطی (ص ۲۹۸۔۲۹۹) (۵) الباعث الحثیث بشرح اختصار علوم الحدیث (ص ۱۰۱) (۶) مرعاۃ المفاتیح (۴/۳۴۳) (۷) دعاء کے آداب واحکام (۱۸۸) (۸) ضعیف احادیث کی معرفت اور ان کی شرعی حیثیت (ص ۲۶۴۔۲۶۵) وغیرہ

علامہ احمد محمد شاکر اپنی کتاب ''الباعث الحثیث'' کے (ص ۱۰۱) کے اندر مذکورہ بالا تینوں شرائط بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں: میرے نزدیک ضعیف حدیث کا ضعف ہر حال میں ظاہر کر دینا ضروری اور واجب ہے تاکہ عوام دھوکا میں پڑ کر اس کو صحیح نہ سمجھ لیں اور ضعیف حدیث پر عمل نہ کرنے کے بارے میں احکام، عقائد اور فضائل اعمال کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے، عمل کے لیے صرف وہی حدیث قابل حجت ہو سکتی ہے جو صحیح یا حسن سند سے مروی ہو۔

اور یہ بات مشہور ہے کہ مذکورہ تینوں شرائط حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے مقرر فرمائی ہے۔ دراصل ان شرائط سے ان کا مقصد ضعیف حدیث پر عمل کرنے سے روکنا ہی تھا۔

لیکن انہوں نے اس کی صراحت نہ کر کے اس پر عمل کرنے کی ایسی شرطیں مقرر فرمائیں جن پر عمل کرنے سے ضعیف حدیث پر عمل خود بخود متروک ہو جائے گا، کیونکہ آں رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "تبیین العجب بما ورد فی فضل رجب" (ص۲۱) کے اندر پہلی شرط بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں!"وینبغی مع ذلک اشتراط ان یعتقد العامل کون ذلک الحدیث ضعیفاً، و ان لا یشہر ذلک، لئلا یعمل المرء بحدیث ضعیف، فیشرع ما لیس بشرع او یراہ بعض الجہال فیظن انہ سنة صحیحة" (سلسلة الاحادیث الضعیفة والموضوعة ۳/۲۵)

اور اس کے ساتھ ساتھ یہ شرط لگانا بھی مناسب ہوگا کہ عمل کرنے والا اس حدیث کے ضعیف ہونے کا اعتقاد رکھے، اور اس کو شہرت نہ دے، تا کہ لوگ ضعیف حدیث پر عمل نہ کرنے لگے اور غیر مشروع امور کو مشروع نہ سمجھ لیں، یا ان کو عمل کرتے ہوئے دیکھ کر بعض نادان لوگ اسے صحیح سنت نہ سمجھ لیں۔

معزز قارئین! ذرا غور کریں، کیا آپ ابن الھمام حنفی، امام نووی اور ابوالحسن قطان رحمہم اللہ وغیرہ کے اقوال پر عمل کرینگے یا قرآن وحدیث پر کیونکہ قرآن وحدیث سے تو پتہ چلتا ہے کہ ضعیف حدیث پر عمل کرنا جائز نہیں، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔

اور اگر آپ دوسرا مسلک مانتے ہیں یعنی شرائط والا، تو غور کریں! کیا آپ ضعیف حدیث کے درجات سے واقف ہیں؟ اگر نہیں تو پھر آپ کو کیسے معلوم ہوگا کہ اس حدیث کا ضعف کس درجہ کا ہے؟

تیسری شرط خود اس بات کے متقاضی ہے کہ ضعیف حدیث پر عمل نہ کیا جائے کیونکہ اس پر عمل کرتے وقت جب ہم یہ اعتقاد ہی نہیں رکھیں گے کہ "یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے" تو پھر اسپر عمل ہی کیوں کریں گے؟۔

(۳) تیسرا مسلک یہ ہے کہ ضعیف حدیث پر مطلقاً عمل کرنا جائز نہیں، خواہ اس کا تعلق عقائد سے ہو یا احکام سے یا فضائل اعمال اور ترغیب وترہیب سے ہو، یہ قول امام بخاری، امام مسلم، امام ابن تیمیہ، امام ابن حزم، امام ابن حبان، امام ابوشامہ، علامہ ابن العربی، علامہ شاطبی، علامہ شوکانیؒ علامہ خطیب بغدادی، امام یحی بن معین، اور علامہ محمد ناصر الدین البانی وغیرہم کا ہے۔ نیز یہ قول مشہور تابعی قتادہ، طاؤس اور ہشام بن عروہ رحمہم اللہ کا ہے ان لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ ضعیف حدیث ظن مرجوح کا فائدہ دیتی ہے یعنی ضعیف حدیث کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل یا تقریر ہونے میں شک ہے، اور قرآن وحدیث میں ظن وشک کی مذمت کی گئی ہے۔ اور اس سے بچنے کی بہت تاکید کی گئی ہے، مثلاً ارشاد ربانی ہے "ان یتبعون الا الظن وان الظن لا یغنی من الحق شیئاً" (سورۃ نجم آیت ۲۸)

اسی طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے" ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث" (صحیح بخاری ۲/۸۹۶ وصحیح مسلم ۲/۲۱۶) اور لغت کی مشہور کتاب "مجمع البحار" (۲/۳۳۵) میں مادہ ظن کے تحت لکھتے ہیں؟" ایاکم و الظن فانہ اکذب الحدیث" اراد بہ الشک، اور صاحب "القاموس" (۲/۳۸۸) لکھتے ہیں! الظن ؟ التردد یعنی ظن کے معنی شک کے ہیں اس اعتبار سے حدیث کا معنی ہو جائیگا "اپنے آپ کو شک وشبہ سے بچاؤ کیونکہ شک سب سے جھوٹی بات ہے"۔ نیز صحیح بخاری میں ہے کہ "وقد کرہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم الظن" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شک کو ناپسند کیا ہے، علاوہ ازیں بہت ساری احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شک وشبہ والی چیزوں سے بچنے کی بہت تاکید کی ہے پس خلاصہ یہ ہوا کہ ضعیف حدیث کا حدیث رسول ہونے میں شک ہے اور شک پر عمل کرنا جائز نہیں اس لیے ضعیف حدیث پر عمل کرنا جائز نہیں۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "**کفی بالمرء کذباً ان یحدث بکل ما سمع**" (مقدمہ صحیح مسلم ۱/۸) آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو بغیر تحقیق و تفتیش کے بیان کر دے۔ اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضعیف حدیث بیان کرنے سے منع کر دیا، تو پھر اس پر عمل کرنا کس طرح جائز ہو سکتا ہے؟

ایک حدیث میں آپ نے فرمایا؟ میری طرف صحیح اور سچی بات منسوب کرو، جو شخص میری طرف ایسی بات منسوب کرتا ہے جو میں نے نہیں کہی تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے (مسند احمد اور ابن ابی شیبہ بسند صحیح دیکھئے سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ للالبانی حدیث نمبر ۱۷۵۳)

اس حدیث میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی بات بیان کرنے سے منع فرمادیا جس کی صحت نسبت کا ہم کو یقین نہ ہو اور ظاہر ہے کہ ضعیف حدیث کی صحت نسبت مشکوک ہوتی ہے۔ تو جب ضعیف حدیث کو بیان کرنا منع ہے تو اس پر عمل کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے؟۔

تیسری بات یہ ہے کہ اگر صحیح اور ضعیف دونوں قسم کی حدیث پر عمل کرینگے تو صحیح اور ضعیف کے درمیان کونسا فرق رہ جاتا ہے؟ لھذا معلوم ہوا کہ فضائل اعمال میں بھی ضعیف حدیث پر عمل کرنا جائز نہیں۔

اور ہمارے علماء کرام کی زبان میں جو یہ بات مشہور ہے کہ کسی ضعیف حدیث کے خلاف اگر کوئی صحیح حدیث موجود نہ ہو تو اس پر عمل کرنا جائز ہے واضح رہے کہ یہ بات صرف علماء کرام کی زبان ہی سے سنائی دیتی ہے اصول حدیث کی کتابوں میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، ہاں یہ بات ضرور ملتی ہے کہ ائمہ کرام قیاس پر ضعیف حدیث کو ترجیح دیتے تھے۔

ایک انتباہ

ہم اس بات کی بھی وضاحت کردینا مناسب سمجھتے ہیں کہ ضعیف اور موضوع حدیث کی بنیاد صحابہ کرام کے آخری دور میں پڑی اور تبھی سے صحابہ کرام رضی اللہ عنھم و تابعین عظام رحمہم اللہ اس سے ہوشیار رہنے لگے اور سند کی چھان بین شروع کردی چنانچہ امام مسلم رحمہ اللہ اپنی "صحیح" کے مقدمہ میں "باب النهي عن الرواية عن الضعفاء والاحتياط في تحملها" کے اندر ابن عباس رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث نقل فرماتے ہیں، عن مجاهد قال جاء بشير بن كعب العدوي الى ابن عباس، فجعل يحدث و يقول: قال الرسول، قال الرسول، فجعل ابن عباس لا ياذن لحديثه و لا ينظر اليه، فقال: يا ابن عباس، مالي لا أراك تسمع لحديثي احدثك عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا تسمع، فقال ابن عباس: انا كنا مرة اذا سمعنا رجلاً يقول: قال رسول الله ﷺ ابتدرته ابصارنا و اصغينا اليه بأذاننا فلما ركب الناس الصعبة والذلول لم نأخذ من الناس الا ما نعرف (مقدمه صحيح مسلم ۱۰/۱)

مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بشیر بن کعب العدوی، عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور قال الرسول: قال الرسول کہہ کر حدیث بیان کرنے لگا مگر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ ان کی طرف توجہ نہیں دے رہے تھے اور ان کی حدیث بھی نہیں سن رہے تھے۔ ان کی بے توجہی دیکھ کر بشیر نے کہا، کیا بات ہے میں حدیث رسول بیان کر رہا ہوں اور آپ اس کی طرف توجہ نہیں دے رہے ہیں؟ اس پر ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایک زمانہ ایسا تھا کہ جب ہم کسی شخص سے قال الرسول

کہتے ہوئے سن لیتے تھے تو فوراً اس کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے اور کان لگا کر اس کی باتوں کو سنتے تھے۔ لیکن جب لوگ صحیح، ضعیف اور موضوع ہر قسم کی حدیث بیان کرنے لگے تو ہم صرف ان سے وہی حدیث لیتے ہیں جن کو ہم جانتے ہیں، یعنی صرف صحیح اور مستند حدیثیں لیتے ہیں (مقدمہ صحیح مسلم ۱/۱۰)

قبل ازیں مذکور ہوا کہ مشہور تابعی ہشام بن عروہ، قتادہ اور طاؤس رحمہم اللہ ضعیف حدیث پر عمل کرنے کو مطلقاً ناجائز کہتے ہیں، خواہ اس کا تعلق عقائد سے ہو یا فضائل اعمال اور احکام سے ہو چنانچہ ہشام بن عروۃ کے سامنے جب یہ حدیث پیش کی گئی "من توضأ علی طهر کتب الله به عشر حسنات" (جامع ترمذی ص۱۰ وسنن ابی داؤد ص۱۰)

"جو شخص وضوء رہتے ہوئے بھی وضوء کرے گا اللہ تعالی اسکو دس نیکیاں دے گا" تو انہوں نے اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: ہذا اسناد مشرقی" (جامع ترمذی ص۱۰) یعنی اس حدیث کے تمام راوی کوفہ کے رہنے والے ہیں اور ان لوگوں کی حدیث ضعیف ہوتی ہے اس لیے یہ حدیث ضعیف ہے۔

کوفیوں کی حدیث کے بارے میں امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ "لیس لحدیث اهل الكوفة نور" بعض حفاظ کو چھوڑ کر اکثر کوفیوں کی حدیث میں روشنی نہیں ہوتی ہے۔ یعنی ان کی حدیث ضعیف ہوتی ہے۔ (سنن ابی داؤد مع عون المعبود ۱۴/۱۴)

حاصل کلام یہ ہے کہ تابعی ہشام بن عروہؒ کے سامنے جب "من توضأ علی طهر..." والی حدیث پیش کی گئی تو انہوں نے اس کو ضعیف قرار دیا۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ حدیث قابل عمل نہیں اور یقیناً یہ حدیث فضائل اعمال سے متعلق ہے۔ لہذا معلوم ہوا کہ ہشام بن عروہؒ بھی فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل کرنے کے قائل نہیں تھے۔

اسی طرح تابعی قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "هل يحمل هذا الحديث عن صالح عن طالح عن صالح حتى يكون صالح عن صالح" (ضعیف احادیث کی معرفت اوران کی شرعی حیثیت ص ۳۱۶ بحوالہ، الکفایۃ فی علم الروایۃ) ثقہ عن ضعیف عن ثقہ کی سند سے حدیث نہیں لی جائے گی جب تک کہ ثقہ عن ثقہ کی سند سے روایت نہ کرے یعنی جب تک صحیح سند کے ساتھ حدیث مروی نہ ہو، تب تک حدیث نہیں لی جائے گی خواہ اس کا تعلق عقائد یا احکام سے ہو یا فضائل اعمال یا ترغیب وترہیب سے ہو۔

اور تابعی طاؤس رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "ان كان مليأ فخذ عنه" اگر حدیث بیان کرنے والا راوی ثقہ ہو تو اسکی حدیث لو (مقدمہ صحیح مسلم ۱۱/۱) اس کا مطلب یہ ہوا کہ ضعیف راوی سے حدیث نہ لو۔

اسی طرح ایک اور تابعی قاسم بن عبید اللہ بن عبداللہ بن عمر ضعیف راوی سے حدیث لینے کے قائل نہیں تھے۔ (مقدمہ صحیح مسلم ۱۳/۱)

ذرا مذکورہ تابعین قتادہ، طاؤس اور قاسم رحمہم اللہ کے اقوال پر غور کریں۔ ضعیف حدیث پر عمل کرنا تو دور کی بات ہے یہ حضرات ضعیف راوی سے حدیث لینے کے ہی قائل نہیں تھے خواہ اس حدیث کا تعلق فضائل اعمال سے ہو یا عقائد اور احکام سے۔

ایک ضروری انتباہ

یہاں پر اس بات کی وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل کرنے کے بارے میں صاحب "مرعاۃ المفاتیح" علامہ عبید اللہ مبارکپوری رحمہ اللہ کا موقف کیا ہے کیونکہ حافظ شیخ عین الباری عالیاوی حفظہ اللہ اپنی کتاب "مسائل قربانی مع توضیحات عینی" کے اندر قربانی کی فضیلت بیان کرتے

ہوئے لکھتے ہیں: علامہ عبیداللہ رحمانی صاحب فرماتے ہیں: ان سب احادیث کی سند اعتراض سے خالی نہ ہونے پر بھی ان کے ایک دوسرے کی تائید کرنے کے سبب تمام کی تمام بحیثیت مجموعی ضعیف سے درجہ حسن کو پہنچ جاتی ہیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عمل کی فضیلت وعظمت کے باب میں ضعیف حدیث قابل قبول ہے۔ (مسائل قربانی ،اشاعت اول ص ۲۰)

حافظ صاحب کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب "مرعاۃ المفاتیح" مطلقاً فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل کے جواز کے قائل ہیں، حالانکہ ان کا موقف یہ نہیں ہے، بلکہ "مرعاۃ المفاتیح" کے مطالعہ سے روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے کہ اس سلسلے میں ان کا یہ موقف کہ فضائل میں ضعیف حدیث پر عمل کیا جائے گا شروع زمانہ کا ہے۔ بعد میں ان کا موقف بدل گیا اور شرائط والا مسلک اختیار کر لیئے جیسا کہ انہوں نے اپنی کتاب "مرعاۃ المفاتیح" کے متعدد مقامات پر اس کی صراحت کی ہے اور وہ تینوں شرائط وہی ہیں۔ جو قبل ازیں اسی کتاب میں گذر چکی ہیں، برائے کرم اس کا مراجعہ کرلیں۔

مرعاۃ المفاتیح کی وہ عبارات ملاحظہ ہوں جن سے حافظ شیخ عین الباری صاحب کو مغالطہ ہوا ہے، صاحب مرعاۃ المفاتیح "باب فی الاضحیۃ" الفصل الثانی کے اندر عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث "ما عمل ابن آدم من عمل یوم النحر احب الی اللہ من اھراق الدم" الحدیث. پر حکم لگاتے ہوئے لکھتے ہیں: لعل الترمذی حسنہ لشواھدہ، وقد ذکرھا المنذری فی الترغیب والھیثمی فی مجمع الزوائد، لکن لا یخلو واحدمنھا عن کلام ویشد بعضھا بعضاً ویبلغ بمجموعھا الی درجۃ الحسن، ولا شک انہ یقبل مثلھا فی فضائل الاعمال (مرعاۃ المفاتیح

۳/۵ ۱۰۴۔۱۰۴)

شاید امام ترمذیؒ نے اس حدیث کو اس کے شواہد کے مدنظر حسن قرار دیا ہے۔ جن شواہد کو منذریؒ نے ''ترغیب'' کے اندر اور، ہیثمیؒ نے ''مجمع الزوائد'' کے اندر بیان کیا ہے، لیکن ان سب احادیث کی کوئی بھی سند اعتراض سے خالی نہیں ہے، پھر بھی ان کے ایک دوسرے کی تائید کرنے کے سبب تمام کے تمام بحیثیت مجموعی درجہ حسن کو پہنچ جاتی ہیں، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جو ضعیف حدیث کثرت طرق کی بناء پر درجہ حسن کو پہنچ جاتی ہے وہ عمل کی فضیلت وعظمت کے باب میں قابل قبول ہے۔

میرے گمان کے مطابق اصل میں حافظ صاحب کو لفظ ''مثلہا'' کے ترجمہ میں تسامح ہوا ہے، اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جو ضعیف حدیث شواہد کی بنیاد پر حسن کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے ایسی ضعیف حدیث فضیلت وعظمت کے باب میں قابل قبول ہے نہ کہ ہر ضعیف حدیث فضائل اعمال میں قابل قبول ہے، کیونکہ صاحب ''مرعاۃ'' کا یہ موقف ہرگز ہرگز نہیں کہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث قابل قبول ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہمارے اندر ایک غلط فہمی یہ بھی ہے کہ کتب ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ کو صحاح ستہ کے نام سے پکارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کتابوں میں جتنی احادیث ہیں ان پر آنکھ بند کر کے عمل کرنا چاہئے۔ یہ قول صحیحین کے حق میں تو سو فی صد درست اور صحیح ہے، مگر ان کے علاوہ بقیہ چار کتابوں کی تمام حدیثوں پر آنکھ بند کر کے عمل کرنا بالکل غلط ہے، کیونکہ ان میں ضعیف حدیثوں کا اچھا خاصہ حصہ ہے، سنن ابن ماجہ اور جامع ترمذی میں تو موضوع حدیثیں بھی ہیں، اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو محدث کبیر علامہ محمد ناصر الدین البانی کی کتاب

''ضعیف سنن ابی داود، ضعیف سنن النسائی، ضعیف سنن الترمذی اور ضعیف سنن ابن ماجہ علاوہ ازیں ان کتابوں کے شروحات کا مطالعہ کریں ان سنن اربعہ میں کتنی ضعیف اور واہی حدیثیں ہیں آپ کو بخوبی معلوم ہو جائے گا۔

اس لیے جب کوئی حدیث سنیں تو اولاً اس کی تحقیق کریں اور جب وہ صحیح یا حسن ثابت ہو جائے تبھی اس پر عمل کریں ورنہ نہیں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کفی بالمرء کذباً ان یحدث بکل ما سمع'' (مقد صحیح مسلم ۱/۸) انسان کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی ہوئی بات کو بغیر تحقیق و تفتیش کے بیان کر دے، اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضعیف حدیث بیان کرنے سے منع فرما دیا تو پھر اس پر عمل کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے؟۔

فضائل اعمال یا ترغیب وترہیب میں ضعیف حدیث پر عمل کرنے کی خرابیاں

فضائل اعمال یا ترغیب وترہیب میں ضعیف حدیث پر عمل کرنے کے نقصانات بہت زیادہ ہیں جن میں سے سب سے بڑا نقصان تو یہ ہے کہ اس سے بہت ساری بدعتیں سنت میں تبدیل ہو جائیگی۔ مثال کے طور پر پندرہویں شعبان کی رات کو لیجئے اس کی فضیلت کے سلسلے میں کئی ایک ضعیف حدیثیں وارد ہیں، جن کو بنیاد بنا کر بہت سارے لوگ شب برأت بناتے ہیں۔

اسی طرح قرآن پڑھ کر مردوں کو اس کا ثواب بخشنے کے بارے میں چار ضعیف حدیثیں آئی ہیں، کیا ان ضعیف احادیث پر عمل کرتے ہوئے قبرستان میں قرآن پڑھنے یا قرآن پڑ کر مردوں کو اس کا ثواب رسائی کرنے اور شب برأت منانے کے جواز کا فتوی دیں گے؟ اگر نہیں تو پھر کیوں؟ اسی لیے نا کہ یہ حدیثیں سب کی سب

ضعیف ہیں، حسن یا صحیح کے درجہ تک نہیں پہنچ رہی ہیں۔

ذرا مندرجہ ذیل حدیث پر غور کیجئے اور سوچئے کہ فضائل اعمال یا ترغیب وترہیب میں ضعیف حدیث پر عمل کرنے کا انجام کتنا خطرناک ہے، ''تبلیغی نصاب'' فضائل نماز (۳۶) مطبع ادارہ اشاعت اسلام، اٹھایئے اس میں ایک ضعیف حدیث اس طرح آئی ہے''روی انہ علیہ السلام قال : من ترک الصلواۃ حتی مضی وقتھا ثم قضا عذب فی النار حقباً ، والحقب ثمانون سنۃ والسنۃ ثلثمائۃ وستون یوماً ، کل یوم مقدارہ الف سنۃ'' یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا گیا ہے کہ جو شخص نماز کو قضا کردے گو وہ بعد میں پڑھ بھی لے پھر بھی وقت پر نہ پڑھنے کی وجہ سے ایک حقب جہنم میں جلے گا، اور ایک حقب کی مقدار اسی ۸۰ برس کی ہوتی ہے اور ایک برس ۳۶۰ تین سو ساٹھ دن کا ہوتا ہے اور قیامت کا ایک دن ایک ہزار برس کے برابر ہوگا اس حساب سے ایک حقب کی مقدار دو کروڑ اٹھاسی لاکھ برس ہوئی۔

یہ حدیث ''تبلیغی نصاب'' فضائل نماز کی دوسری فصل (۳۶) کے اندر ہے ''مولانا زکریا'' رحمۃ اللہ علیہ کو سب سے پہلے اس حدیث کی سند سے متعلق علمی بحث کرنی چاہیے تھی، مگر انہوں نے کتاب ''مجالس الابرار'' کا حوالہ دیتے ہوئے صرف اتنا لکھ دیا کہ ''کذا فی مجالس الأبرار'' قلت : لم اجدہ فیما عندی من کتب الحدیث الا ان مجالس الابرار مدحہ شیخ مشائخنا الشاہ عبد العزیز الدھلوی'' یہ حدیث اسی طرح ''مجالس الابرار'' کے اندر ہے میں کہتا ہوں کہ میرے پاس حدیث کی جتنی کتابیں ہیں، ان میں مجھے یہ حدیث مجھے نہیں ملی، چونکہ کتاب ''مجالس الابرار'' کی ہمارے شیخ مشائخ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے بہت تعریف کی ہے، اس لیے میں نے اس حدیث کو یہاں بیان کردیا۔

معزز قارئین ! مولانا زکریا رحمہ اللہ کی فریب دہی دیکھئے کہ انہوں نے الفاظ حدیث کا اردو میں ترجمہ تو کر دیا، مگر اس عربی عبارت کا جس میں اس حدیث کی معمولی تحقیق پیش کی گئی ہے، اردو ترجمہ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی، صرف یہی نہیں، بلکہ ''تبلیغی نصاب'' کے بے شمار مواقع میں ان کا یہی رویہ رہا ہے، یہ اردو داں حضرات جو عربی نہیں جانتے ہیں، ان کے لیے دھوکا نہیں تو پھر اور کیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے جیسا کہ لفظ ''روی'' اور خود مولانا موصوف کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے، ایسی صورت میں اس حدیث پر عمل کرنے کی خرابی کیا ہے، ذرا وہ بھی سن لیجئے خصوصاً میں اپنے ان بھائیوں سے کہتا ہوں جو ترغیب و ترہیب میں ضعیف حدیث پر عمل کرنے کو مستحب اور جائز سمجھتے ہیں، صحیح بخاری (۸۹/۱ و ۲۲۶/۱) اٹھا کر دیکھیں اس میں آپ کو آسانی کے ساتھ مل جائے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی جنگ خندق میں عصر کی نماز قضاء ہوئی تھی اور سورج غروب ہونے کے بعد آپ نے مع اپنے اصحاب کے ادا کیا تھا، اسی طرح صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ جنگ خیبر سے واپسی کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فجر کی نماز قضاء ہوئی تھی اور سورج طلوع ہونے کے بعد آپ صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام کے ساتھ ادا کیا تھا۔

اب ''تبلیغی نصاب'' کی مذکورہ حدیث کے مطابق آپ ہی فیصلہ کریں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا دو وقتوں کی نماز قضاء ہوئی، جس کے مطابق کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جن صحابہ کرام کی نماز قضاء ہوئی وہ دو حقب جہنم میں جلیں گے؟ نعوذ باللہ من ذلک، صرف یہی نہیں بلکہ دنیا کے تمام مسلمان سلف وخلف سب کے سب کم از کم ایک دو حقب ضرور جہنم میں جلیں گے، کیونکہ دنیا میں کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے جس کی ایک یا دو نمازیں قضاء نہ ہوتی ہوں الا ماشاء اللہ۔

اتنی جسارت ! آپ نے کبھی غور بھی نہیں کیا اور ضعیف حدیث پر عمل کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اور تمام مسلمانوں کو ایک دوحقب کے لیے جہنم میں دھکیل دیا؟ میرے ایک بھائی نے کہا تھا کہ یہ ڈرانے کے لیے کہا گیا ہے۔ مگر ڈرانے کی بھی حد ہوتی ہے اس کے حدود میں رہ کر ڈرایئے اور حد سے تجاوز نہ کریں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ قرآن واحادیث صحیحہ کو پس پشت ڈالتے ہوئے من گڑھت باتوں کو فروغ دے رہے ہیں جو ضلالت وگمراہی کا سبب بنیں؟۔

میرے ایک دوسرے بھائی نے کہا تھا کہ یہ اس شخص کے لیے ہے جو "بلا عذر" نماز قضاء کر دے، میں نے اس سے کہا کہ ذرا الفاظ حدیث پر غور کریں اور بے جا و بے محل اپنی طرف سے باطل تاویل نہ کریں، تاویل صحیح حدیث کی کی جاتی ہے، ضعیف حدیث کی نہیں، اس لیے تعصب پرست نہ بنیں اور عدل اور انصاف سے کام لیں، اس حدیث کے اندر عذر وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

معزز قارئین ! دیکھا آپ نے فضائل اعمال یا ترغیب وترہیب میں ضعیف حدیث پر عمل کرنے کی خرابیاں کیا کیا ہیں؟ اس طرح کی ضعیف حدیثوں کی مثالیں بے شمار دیکھی جا سکتی ہیں۔ مگر نصیحت کے لیے بطور نمونہ یہی ایک مثال کافی ہے۔

آخری بات

جو حضرات ابن الہمام حنفی، امام نووی اور ابوالحسن قطان رحمہم اللہ وغیرہ کے قول کو دلیل بنا کر فضائل اعمال میں ضعیف حدیث پر عمل کرنے کے قائل ہیں، ان کو سوچنا چاہیئے کہ آیا مذکورہ تینوں حضرات کے اقوال قابل عمل ہیں یا حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ اگر آپ شق ثانی کو اختیار کرتے ہیں تو سنیئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ضعیف حدیث پر عمل کرنے سے مطلقا منع فرمایا ہے، اس لیے آپ بھی ضعیف

حدیث پر عمل کرنا مطلقاً چھوڑ دیں اور صحیح احادیث سے ثابت شدہ امر پر ہی عمل کریں اور یہ بات ذہن نشین کرلیں کہ فرض نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا کسی بھی صحیح حدیث سے ثابت نہیں، اور جس چیز کا بھی ثبوت قرآن وصحیح حدیث میں نہ ہو اس کو نیکی کی نیت سے کرنا ہی بدعت کہلاتا ہے، چاہے اس کو ضروری سمجھ کر کریں یا غیر ضروری سمجھ کر، چاہے آپ اس دعا کو جزءِ نماز شمار کریں، یا نہ کریں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے "ہر بدعت گمراہی ہے" لہٰذا بدعت ہر حال میں بدعت ہی رہتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری لغزشوں کو معاف فرمائے اور ہم سب مسلمانوں کو اتباعِ سنت اور اجتناب بدعت نیز قرآن وحدیث کے مطابق عمل کرنے کی توفیق دے (آمین)

نمازِ عیدین کے بعد مروجہ اجتماعی دعا کی شرعی حیثیت

عیدین کی نماز یا خطبہ کے بعد امام ہاتھ اٹھا کر دعا کرے اور مقتدی حضرات ہاتھ اٹھا کر ان کی دعا پر آمین آمین کہتے جائیں، دعا کی یہ ہیئت نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور نہ صحابہ کرام وتابعین عظام سے نہ بسند صحیح اور نہ بسند ضعیف حتی کہ تبع تابعین وائمہ عظام سے بھی منقول نہیں ہے۔

جو لوگ عیدین کی نماز یا خطبہ کے بعد مروجہ اجتماعی دعاء کے قائل ہیں وہ حضرات مندرجہ ذیل احادیث دلیل میں پیش کرتے ہیں۔

(۱) صحیح بخاری جلد اول ص ۱۳۲ میں ام عطیہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں: **كنا نؤمر ان نخرج يوم العيد، حتى نخرج البكر من خدرها ، حتى نخرج الحيض، فيكن خلف الناس ، فيكبرن بتكبيرهم ويدعون بدعائهم ويرجون بركة ذلك اليوم وطهرته.** ہم کو حکم دیا جاتا تھا

کہ عید کے دن باکرہ بالغہ کو گھر سے نکالیں، یہاں تک کہ حائضہ عورتوں کو بھی۔ پس حائضہ عورتیں لوگوں کے پیچھے رہے گی اور لوگوں کے ساتھ تکبیریں پکارے گی، ان کے ساتھ دعائیں کرے گی اور اس دن کی برکت و گناہوں سے پاکی کی امید کرے گی۔

(۲) نیز صحیح مسلم ۱/۲۹۱ میں ام عطیہ رضی اللہ عنہا ہی سے مروی ہے: امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان نخرجھن فی الفطر و الاضحی العواتق والحیض و ذوات الخدور، فاما الحیض فیعتزلن الصلواۃ ویشھدن الخیر و دعوۃ المسلمین ۔ ام عطیہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو حکم دیا ہے کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ میں آزاد، حائضہ اور پردہ میں رہنے والی عورتوں کو بھی عید گاہ لے جائیں، پس حائضہ عورتیں نماز سے الگ رہے گی اور خیر و برکت اور مسلمانوں کی دعا میں شریک رہے گی۔

ان حضرات کا طرز استدلال یہ ہے کہ ان دونوں حدیثوں میں کہا گیا ہے کہ حائضہ عورتیں عید کی نماز سے الگ رہے گی لیکن مسلمانوں کی دعاؤں میں شریک رہے گی۔ اور دعا میں ہاتھ اٹھانا مستحب ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری جلد دوم ۹۳۸ میں امام بخاریؒ نے باب منعقد کیا ہے "باب رفع الایدی فی الدعاء" اور اس میں ابو موسیٰ اشعری، عبداللہ بن عمر اور انس رضی اللہ عنہم کی دعا میں ہاتھ اٹھانے کی حدیث بیان کی ہے لہٰذا عیدین کے بعد مروجہ اجتماعی دعا مستحب ہے۔

ان حضرات کی خدمت میں عرض یہ ہے کہ اس طرز استدلال سے وضوء کے بعد، مسجد میں داخل ہوتے وقت، اس سے نکلتے وقت، سوتے اور جاگتے وقت، قضا حاجت کے لیے جاتے وقت، اس سے فراغت کے بعد، کپڑا پہنتے وقت اور کھانے کے بعد وغیرہ وغیرہ یعنی ہر دعا میں ہاتھ اٹھانا مستحب ہو جائیگا حالانکہ ان مواقع کی ادعیہ میں ہاتھ اٹھانا کسی بھی حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

واضح رہے کہ قبل ازیں دلائل کے ساتھ ثابت کیا جا چکا ہے کہ دعا ایک عبادت ہے اور عبادت میں توقیف ضروری ہے جہاں پر جس طرح سے ثابت ہے وہاں پر اسی طرح ادا کرنا ضروری ہے۔ اس میں کسی قسم کی کمی وزیادتی جائز نہیں ہے اور یہ بھی ثابت کیا جا چکا ہے کہ ہاتھ اٹھا کر دعا صرف وہیں مانگی جا سکتی ہے جہاں پر ثابت ہو اور جہاں پر ثابت نہیں، وہاں دعا میں ہاتھ نہ اٹھانا ہی سنت ہے، اور مذکورہ حدیث میں صرف دعا کا ذکر ہے، اس میں کسی کیفیت وہیئت کا ذکر یعنی امام کا ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا اور مقتدی حضرات کا ان کی دعا پر ہاتھ اٹھا کر آمین آمین کہتے جانا یا انفرادی طور پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا اس کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے، لہٰذا اس سے بغیر ہاتھ اٹھائے دعا کرنا مراد ہوگا، اور اس حدیث سے مروجہ طریقے سے دعا مانگنے پر استدلال کرنا قطعاً غلط ہے۔ جیسا کہ محدث ہند، عرب وعجم کا سرتاج علامہ عبیداللہ مبارکپوری رحمۃ اللہ علیہ اپنی مایہ ناز کتاب ''مرعاۃ المفاتیح'' ۵/۳۱ کے اندر فرماتے ہیں: واستدل بقوله ''دعوة المسلمين'' على مشروعية الدعاء بعد صلاة العيد، كما يدعى دبر الصلوات الخمس، وفيه نظر، لانه لم يثبت عن النبى صلى الله عليه وسلم دعاء صلواة العيدين، ولم ينقل احد الدعاء بعدها بل الثابت عنه صلى الله عليه وسلم انه كان يخطب بعد الصلواة من غير فصل بشئى آخر، فلا يصح التمسك باطلاق قوله، ''دعوة المسلمين'' والظاهر ان المراد بها الأذكار التى فى الخطبة وكلمات الوعظ والنصح، فان لفظ الدعوة عام، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ''دعوة المسلمين'' سے بعض لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ پنجگانہ نمازوں کے بعد جس طرح دعا مانگی جاتی ہے اسی طرح نماز عیدین کے بعد بھی دعا مانگنی مشروع ہے، لیکن یہ استدلال غلط ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عیدین کی نماز کے بعد دعا

ثابت نہیں ہے اور نہ کسی نے نماز عیدین کے بعد دعا بیان کیا ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نماز کے بعد بلا کسی چیز کے فاصلہ کے خطبہ دیتے تھے۔ پس آپ کا قول ''دعوۃ المسلمین'' کے اطلاق سے دلیل پکڑنا درست نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے خطبہ کے اندر ذکر واذکار اور وعظ و نصیحت کے کلمات مراد ہیں کیونکہ ''دعوۃ'' کا لفظ عام ہے۔

جو لوگ عیدین کے بعد مروجہ اجتماعی دعا کے استحباب کے قائل ہیں ان حضرات کو انس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث پر غور کرنا چاہئے جسے امام بخاری نے اپنی صحیح کے جلد اول ''باب رفع الامام یدہ فی الاستسقاء'' میں بیان کیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: ''**كان رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يرفع يديه في شئى من دعائه الا في الاستسقاء وانه يرفع حتى يرى بياض ابطيه**'' نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف استسقاء کی دعا میں ہاتھ اٹھاتے تھے، اتنا اوپر اٹھاتے تھے کہ آپ کی بغل کی سفیدی نظر آنے لگتی۔

ذرا غور کیجئے! جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ آئے اس وقت انس رضی اللہ عنہ کی عمر دس سال کی تھی اور اس وقت سے لیکر آپ کی وفات تک یعنی دس سال تک انھوں نے آپ کی خدمت کی ہے۔ اس دوران انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پنجگانہ نمازوں میں، عیدین کی نمازوں میں اور استسقاء وغیرہ میں شریک رہے، لیکن انھوں نے صرف استسقاء کی دعا میں آپ کو ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھا، پنجگانہ نمازوں کے بعد، عیدین کی نماز یا خطبہ کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہوئے نہیں دیکھا، حالانکہ بہت سارے مقامات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی ہے، چونکہ ان مقامات میں انس رضی اللہ عنہ حاضر نہیں تھے اس لیے انھوں نے نہیں دیکھا، لیکن عیدین میں تو ضرور حاضر تھے اور انھوں نے عیدین

سے متعلق بہت ساری احادیث روایت کی ہے، اسکا مطلب یہ ہوا کہ آپ عیدین کی نماز یا خطبہ کے بعد مروجہ اجتماعی دعا نہیں کرتے تھے ورنہ انس رضی اللہ عنہ ضرور دیکھتے اور اسے روایت کر دیتے لھذا معلوم ہوا کہ یہ غیر ثابت شدہ عمل ہے۔

نیز امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کے "کتاب العیدین، باب العلم الذی بالمصلی" کے اندر بیان کیا ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا "اشهدت العيد مع النبي صلى الله عليه وسلم، قال: نعم، ولولا مكاني من الصغر ما شهدته، حتى اتى العلم الذى عند دار كثير بن الصلت، فصلى ثم خطب، ثم اتى النساء فوعظهن وذكر هن و أمرهن بالصدقة، فرأيتهن يهوين بأيديهن يقذفنه في ثوب بلال ثم انطلق هو وبلال الى بيته.

یعنی ابن عباس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ، رسول اللہ صلی علیہ وسلم کے ساتھ عید میں شریک ہوئے ہیں تو انہوں نے فرمایا کہ ہاں! یعنی میں شریک ہوا ہوں، اگر آپ کے ساتھ میری رشتہ داری نہ ہوتی تو چھوٹے ہونے کی وجہ سے شاید میں شریک نہ ہوتا، آپ اسی جگہ میں گئے جو کثیر بن صلت کے گھر کے پاس ہے اور آپ نے نماز پڑھائی پھر خطبہ دیا، پھر عورتوں کے پاس گئے اور آپ کے ساتھ بلال بھی تھے آپ نے عورتوں کو وعظ ونصیحت کی اور انہیں صدقہ کرنے کا حکم دیا، میں نے عورتوں کو دیکھا کہ اپنے ہاتھ سے بلال کے کپڑے میں کچھ پھینکتی جا رہی ہیں پھر آپ ﷺ اور بلال اپنے گھر واپس آ گئے۔

ذرا غور کریں! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز پڑھائی اس کے بعد خطبہ دیا، پھر عورتوں کے پاس گئے وہاں وعظ ونصیحت کی اور ان کو صدقہ کرنے کا حکم دیا پھر آپ ﷺ اور بلال دونوں گھر واپس چلے گئے، سوال یہ ہے کہ آپ ﷺ نے مروجہ دعا کب مانگی اگر مانگے ہوتے تو ابن عباس رضی اللہ عنہ اس کو ضرور بیان کر

دیتے، لہذا ارتفاع موانع اور دواعی نقل کے ہوتے ہوئے عدم نقل عدم وقوع کی دلیل ہے اور عدم وقوع ہی عدم جواز کی دلیل ہے، لہذا عیدین کی نماز یا خطبہ کے بعد مروجہ اجتماعی دعا غیر ثابت شدہ عمل ہونے کی وجہ سے بدعت ہے۔

افطار کی دعا

افطار کے وقت پڑھی جانے والی دعاؤں میں سے دو دعائیں زیادہ مشہور ہیں۔

(۱) اللھم لک صمت و علی رزقک افطرت (۲) ذھب الظماء وابتلت العروق وثبت الاجر ان شاء اللہ، یہ دونوں دعاء سنن ابی داود کتاب الصیام، باب القول عند الافطار کے اندر دیکھی جا سکتی ہیں۔ پھر ان دونوں میں سے پہلی دعا کو زیادہ شہرت حاصل ہے۔ اور یہ بات بھی مشہور ہے کہ پہلی دعاء افطار کے شروع میں پڑھنی چاہیے اور دوسری دعاء افطار کے بعد پڑھنی چاہیے۔ حالانکہ حدیث میں دونوں دعاء کے متعلق **"کان رسول اللہ ﷺ اذا افطر"** یا **ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا افطر"** کے الفاظ آئے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب افطار کرتے تھے تو یہ دعاء پڑھتے تھے۔

دوسری دعا کو امام نسائی نے "سنن کبریٰ" کے اندر، امام ابن السنیؒ نے "عمل الیوم واللیلۃ" کے اندر ابوداود، امام بیہقی اور امام دار قطنی نے اپنی اپنی "سنن" کے اندر اور امام حاکم نے "مستدرک" کے اندر حسن سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔ (ارواء الغلیل ۳۹/٤ وصحیح سنن ابی داود کتاب الصیام باب القول عند الافطار ومرعاۃ المفاتیح ٦/ ٤٧٤)

جبکہ پہلی دعا کو علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے "تحقیق المشکوۃ" کے اندر حسن اور "صحیح ابن خزیمہ" کی تعلیق کے اندر صحیح قرار دیا ہے۔ لیکن انھوں نے اپنے اس

قول سے رجوع کرلیا ہے اور ''ضعیف سنن ابی داوٗد'' ص:۱۸۳ اور ''ارواء الغلیل'' حدیث نمبر: ۹۱۹ کے اندر اسکو ضعیف قرار دیا ہے اور ''ارواء الغلیل'' میں وضاحت کردیا ہے کہ دوسرے محدثین سے متاثر ہوکر میں نے بھی اس کو ''صحیح ابن خزیمہ'' کی تعلیق میں صحیح قرار دیا تھا حالانکہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ (ارواء الغلیل ٤/٣٩ والتنبیهات الملیحة علی ما تراجع عنه المحدث الالبانی من الاحادیث الضعیفة او الصحیحة حدیث نمبر: ٢٧)

چونکہ اس حدیث کی صحت وضعف کے سلسلے میں اختلاف ہے اس لیے اس کی سند کی تفصیلی بحث کرنی ضروری ہے تاکہ روز روشن کی طرح عیاں ہوجائے کہ حقیقت کیا ہے۔ منجملہ یہ حدیث تین طرق سے مروی ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے:

پہلا طریق ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: "کان النبی ﷺ اذا افطر قال "اللهم لک صمنا، وعلی رزقک افطرنا، اللهم تقبل منا، انک انت السمیع العلیم"

اس کو امام دار قطنی نے ''سنن'' کے اندر، امام ابن السنی نے "عمل الیوم واللیلة" کے اندر، اور امام طبرانی نے ''معجم کبیر'' کے اندر "عبد الملک بن هارون بن عنترة عن ابیه عن جده عن ابن عباس" کی سند سے روایت کیا ہے جس کو علامہ شوکانی نے ضعیف قرار دیا ہے (نیل الاوطار ۴/۳۰۵)۔ اس سند پر حکم لگاتے ہوئے مشہور محدث محمد ناصر الدین البانیؒ فرماتے ہیں۔ یہ سند ضعیف جدا ہے کیونکہ اس میں دو علتیں ہیں۔

پہلی علت: عبد الملک بن ہارون انتہائی ضعیف راوی ہیں۔ حافظ ذہبیؒ ''الضعفاء'' کے اندر فرماتے ہیں: محدثین نے ان سے حدیث لینا چھوڑ دیا ہے۔ اور امام سعدیؒ نے ان کو دجال کہا ہے۔ حافظ ہیثمیؒ نے بھی یہی قول نقل کیا ہے (فیض

القدیر ۵/۱۰۷)

دوسری علت: ہارون بن عنترۃ مختلف فیہ راوی ہے۔ کیونکہ امام ذہبیؒ "میزان الاعتدل" کے اندر فرماتے ہیں کہ امام دار قطنیؒ نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے اور امام ابن حبانؒ نے ان کو "الضعفاء" میں شمار کرتے ہوئے فرمایا: وہ بہت ہی منکر الحدیث راوی ہے۔ اور کثرت کے ساتھ منکر حدیثیں روایت کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں دل میں کھٹکا ہوتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر منکر حدیثیں روایت کرتے ہیں۔ کسی بھی حالات میں ان کی حدیث سے دلیل پکڑنا جائز نہیں۔ امام ابن حبانؒ نے ان کو ثقات کے اندر بھی داخل کیا ہے اور کچھ لوگوں نے ان کی توثیق بھی کی ہے۔ اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ "تقریب" کے اندر فرماتے ہیں کہ ان سے حدیث لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سند کی آفت عبدالملک بن ہارون ہیں یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن القیمؒ نے "زاد المعاد" کے اندر فرمایا: "لایثبت" یہ حدیث ثابت نہیں ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے "تلخیص الحبیر" کے اندر فرمایا: اس کی سند ضعیف ہے۔ اسی طرح حافظ ہیثمیؒ نے بھی مجمع الزوائد (۱/۱۵۶) کے اندر فرمایا: اس کو امام طبرانی نے "کبیر" کے اندر روایت کیا ہے اس کی سند میں عبدالملک بن ہارون ہیں جو ضعیف ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے "تلخیص الحبیر" کے اندر اس سند پر صرف ضعف کا حکم لگایا ہے حالانکہ دوسری جگہ میں انھوں نے اسی سند پر "واہ جداً" کا حکم لگا ہے۔ چنانچہ علامہ مناوی اپنی کتاب "فیض القدیر" ۵/۱۰۷ کے اندر فرماتے ہیں کہ "قال ابن حجر: غریب من هذا الوجه وسنده واه جداً وهارون بن عنترة كذبوه." اس طریق سے یہ حدیث غریب ہے اور اس کی سند بہت واہی ہے، ہارون

بن عنترة کو محدثین نے جھوٹا قرار دیا ہے۔

علامہ البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو صرف ضعیف قرار دینا ان کا (علامہ ابن القیم، حافظ ابن حجر عسقلانی اور علامہ ہیثمی) تساہل ہے کیونکہ ان کو اس سند پر ضعیف جدا کا حکم لگانا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ یہ حدیث ضعیف جدا ہے لیکن چونکہ انہوں نے اس پر صرف ضعف کا حکم لگایا ہے اس لیے ان کے اس طرز عمل سے اور مشہور قاعدہ ''ضعیف حدیث کثرت طرق سے آنے کی وجہ سے مضبوط ہو جاتی ہے۔'' پر اعتماد کرتے ہوئے کسی عالم کا دھوکہ میں پڑنے کا اندیشہ ہے۔ وہ اس طرح سے کہ آگے آنے والی انس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے ذریعہ تقویت دے کر ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو حسن کے درجہ تک پہنچا دے گا۔ حالانکہ ضعیف حدیث کا کثرت طرق کی بنا پر حسن کے درجہ تک پہنچنے کی شرائط میں سے ایک شرط یہ ہے کہ ان سندوں میں سے ہر ایک کے اندر شدید ضعف نہ ہو اور تحقیق سے معلوم ہو گیا کہ اس کے اندر شدید ضعف ہے۔ (ارواء الغلیل ۴/۳۶، ۳۷)

لہٰذا اس سند کا حسن کے درجہ تک پہنچنے کا امکان نہیں ہے یا اس کے ذریعہ کسی دوسری سند کو بھی تقویت حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ ضعیف جدا ہے۔

دوسرا طریق انس رضی اللہ عنہ کا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ''کان رسول اللہ اذا افطر قال: بسم اللہ، اللھم لک صمت وعلی رزقک افطرت'' اس کو امام طبرانی نے ''معجم اوسط'' اور ''معجم صغیر'' کے اندر امام ابو نعیم نے ''اخبار اصبہان'' کے اندر ''اسماعیل بن عمرو البجلی: ثنا داود بن الزبرقان ثنا شعبة عن ثابت البنانی عن انس'' کی سند سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔

اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد امام طبرانی خود فرماتے ہیں: اسماعیل بن عمرو اس کو روایت کرنے میں منفرد ہیں۔ علامہ محمد ناصر الدین البانی فرماتے ہیں کہ وہ

ضعیف ہیں۔ امام ذہبی نے ''الضعفاء'' کے اندر فرمایا: ضعفہ غیر واحد۔ بہت سارے محدثین نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے۔

اس سند کا دوسرا راوی داود بن الزبرقان بہت ہی ضعیف راوی ہے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں: امام ابوداود نے ان کو متروک کہا ہے اور امام بخاری نے ان کے بارے میں ''مقارب الحدیث'' فرمایا ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے ''تقریب'' کے اندر فرمایا کہ وہ متروک راوی ہے۔ امام ازدی نے ان کو جھوٹا قرار دیا ہے اور علامہ شوکانی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند ضعیف ہے کیونکہ داود بن زبرقان متردک ہے۔ (نیل الاوطار) واضح رہے کہ متروک راوی کی حدیث ضعیف جدا ہوتی ہے۔

اس حدیث کے بارے میں حافظ ہیثمیؒ فرماتے ہیں اس کو امام طبرانی نے ''اوسط'' کے اندر روایت کیا ہے۔ اس کی سند میں داود بن الزبرقان ایک راوی ہے جو ضعیف ہیں۔ (ارواء الغلیل ۴/۳۷، ۳۸)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ سند بھی ضعیف جدا ہے اس کے ذریعہ کسی حدیث کو تقویت نہیں پہنچائی جاسکتی۔

تیسرا طریق مرسل ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ان النبی کان اذا افطر قال: اللھم لک صمت وعلی رزقک افطرت

اس کو امام ابوداود اور امام بیہقی نے ''سنن'' کے اندر، امام عبداللہ بن مبارک نے ''الزہد'' کے اندر امام ابن صاعد نے ''الزوائد علیه'' کے اندر امام ابن ابی شیبہ نے ''مصنف'' کے اندر اور امام ابن السنی نے ''عمل الیوم واللیلة'' کے اندر حصین بن عبدالرحمٰن عن معاذ ابی زہرہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ البتہ امام ابوداود نے ''انه بلغه'' کا لفظ بھی زیادہ کیا ہے اس سند پر حکم لگاتے ہوئے علامہ محمد ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ سند ضعیف ہے کیونکہ یہ مرسل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا

ایک راوی معاذ مجہول بھی ہے۔ کیونکہ ان سے روایت کرنے والا حصین بن عبدالرحمن کے علاوہ اور کوئی دوسرا راوی نہیں ہے۔

معاذ کو امام ابن ابی حاتم نے کتاب ''الجرح والتعدیل'' کے اندر بیان کیا ہے لیکن ان کے بارے میں نہ انہوں نے جرح کی ہے اور نہ تعدیل۔ امام ابن حبان نے ان کو ثقات تابعین کے اندر ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے ان کو صرف ''مقبول'' قرار دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ متابعت کے وقت ان کی حدیث لی جائے گی اور یہاں پر یہ چیز مفقود ہے یعنی ان کا کوئی متابع نہیں ہے۔ علامہ البانیؒ فرماتے ہیں اب کس چیز کی بنیاد پر اس کو قابل حجت قرار دیا جاسکتا ہے جب کہ مذکورہ دونوں سندیں ضعیف جدا ہیں جن سے استشہاد جائز نہیں۔ پس ان کی حدیث ضعیف کے ضعیف ہی رہ جاتی ہے۔ (ارواء الغلیل: ۴/۳۹)

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ معاذ کی اس حدیث کے بارے میں فرماتے ہیں کہ یہ حدیث مرسل ہونے کے باوجود اس جیسے موقع پر حجت ہوگی کیونکہ اس کو امام طبرانی اور امام دارقطنی نے متصل لیکن ضعیف سند کے ساتھ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے (مرعاۃ المفاتیح ۶/۵۷۴)۔ یاد رہے کہ یہ موصوف کی تضاد بیانی ہے کیونکہ ماقبل میں ''فیض القدیر'' کے حوالہ سے گذرا کہ خود انھوں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اس حدیث پر ''واہ جداً'' کا حکم لگایا ہے۔

معزز قارئین! قبل ازیں آپ کو معلوم ہو گیا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث ضعیف جدا ہے اور اس کو صرف ضعیف قرار دینا حافظ ابن حجر عسقلانی کا تساہل ہے۔ اسی وجہ سے انہوں نے معاذ کی اس حدیث کو ابن عباس رضی اللہ عنہ کی ضعیف جدا حدیث کے ذریعہ تقویت پہنچا دیا ہے۔ نیز حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کے تساہل سے اور علامہ محمد ناصر الدین البانیؒ کی ''مشکوۃ'' کی تحقیق سے متاثر ہو کر محدث ہند صاحب ''

مرعاۃ المفاتیح'' علامہ عبید اللہ مبارکپوری رحمہ اللہ نے بھی انس اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کی مذکورہ دونوں ضعیف جدا حدیث کو معاذ کی اس حدیث کا شاہد قرار دے کر اس کو تقویت پہنچادیا ہے۔ (مرعاۃ المفاتیح ۶/۴۷۵) ایسا اس لیے ہوا کہ انہوں نے انس رضی اللہ عنہ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کو صرف ضعیف خیال کرلیا ہے حالانکہ یہ دونوں حدیثیں ضعیف جدا ہیں جن کے ذریعہ کسی حدیث کو تقویت حاصل نہیں ہو سکتی، لہٰذا معاذ کی یہ حدیث ضعیف ہی رہ جاتی ہے۔

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا: بسم اللہ وکل بیمینک'' (رواہ مسلم) کھانے کے شروع میں ''بسم اللہ'' کہو اور اپنے دائیں ہاتھ سے کھاؤ۔ لہذا عام کھانے کی طرح افطار کے شروع میں بھی ''بسم اللہ'' کہہ کر افطار کرلیا جائے اور اس کے بعد ''ذھب الظماء وابتلت العروق وثبت الاجر انشاء اللہ'' پڑھ لیا جائے۔

واضح رہے کہ عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث جس میں افطار کے وقت دعا قبول ہونے کا ذکر ہے وہ ضعیف ہے (ارواء الغلیل رقم الحدیث ۹۲۱) اور افطار کے وقت ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا خواہ انفرادی طور پر ہو یا اجتماعی طور پر کسی بھی حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

عقد نکاح کے وقت ہاتھ اٹھا کر اجتماعی دعا مانگنا

ہمارے ملک کے بعض علاقوں میں عقد نکاح کے وقت یعنی شادی پڑھانے کے بعد قاضی صاحب ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتا ہے اور حاضرین مجلس ان کی دعا پر ہاتھ اٹھا کر آمین آمین کہتے جاتے ہیں، حالانکہ اس موقع پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا خواہ انفرادی طور پر ہو یا اجتماعی طور پر کسی بھی حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم متزوج کے لیے (خواہ

عقد نکاح کی مجلس میں ہو یا بعد میں) ان الفاظ کے ذریعہ دعا دیتے تھے "بارک الله لک و بارک علیک و جمع بینکما فی خیر"

اس حدیث کو "اصحاب السنن" امام ابن حبانؒ اور امام حاکمؒ نے "مستدرک" کے اندر بسند صحیح روایت کیا ہے، نیز دیکھئے: صحیح سنن ابی داؤد کتاب النکاح ، باب ما یقال للمتزوج.

☆☆☆
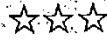
اختتام مجلس کی دعا

ابو برزہ اسلمی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ "کان رسول الله صلی الله علیه وسلم یقول بآخرة اذا اراد ان یقوم من المجلس : سبحانک اللهم و بحمدک اشهد ان لا اله الا انت استغفرک و اتوب الیک ، فقال رجل: یا رسول الله صلی الله علیه وسلم انک لتقول قولاً ما کنت تقوله فیما مضی، قال کفارة لما یکون فی المجلس.
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اختتام مجلس میں جب مجلس سے کھڑے ہونے کا ارادہ کرتے تو یہ دعا پڑھتے تھے:"سبحانک اللهم و بحمدک اشهد ان لا اله الا انت استغفرک و اتوب الیک" یہ دعا سن کر ایک آدمی نے سوال کیا، یا رسول اللہ علیہ وسلم آپ نے آج ایسی بات کہی جسے اس سے قبل کبھی بھی نہیں کہتے تھے، اس پر آپ نے فرمایا: مجلس میں جو غلطی ہوئی ہے اسکے کفارۃ کے طور پر میں نے یہ دعا پڑھی ہے۔ (سنن ابی داؤد بسند صحیح ، کتاب الادب ، باب فی کفارة المجلس)

عمل الیوم و اللیلة للنسائی کے اندر عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی مجلس میں تشریف رکھتے یا قرآن کریم کی تلاوت فرماتے یا نماز پڑھتے تو مذکورہ دعا کے ذریعہ اختتام کرتے (حصن المسلم اردو ص ۱۵۵)

مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا کہ قرآن کی تلاوت کے اختتام میں یا حدیث کی کوئی کتاب ختم کرتے وقت یا اختتام مجلس کے وقت مذکورہ دعا پڑھ لینا ہی کافی ہے

اس سے مجلس کے اندر کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے، اور جہاں تک اس موقع پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا سوال ہے تو خواہ وہ انفرادی طور پر ہو یا اجتماعی طور پر اس کا ثبوت نہیں ہے اس لیے اس سے اجتناب ضروری ہے واضح رہے کہ ہمارے ملک کے بعض مدارس میں ختم بخاری یا جشن بخاری کے وقت استاد، طلبہ اور حاضرین مجلس اجتماعی طور پر مروجہ طریقے سے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگتے ہیں یہ صریح بدعت ہے۔ کیونکہ اس کا ثبوت نہیں ہے۔

جبکہ بعض مدارس میں گائے اور بیل ذبح کرتے ہیں یا پھر مٹھائیاں اور پراٹھے پکاتے اور دعوت نامہ چھپوا کر عوام وخواص کو دعوت دیتے ہیں یہ فضول خرچ ہے اور فضول خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اس لیے بہت جلد اسکو چھوڑ دینا چاہیے۔

دفن میت کے بعد مروجہ اجتماعی دعا کی شرعی حیثیت

میت کو دفن کرنے کے بعد اس کے لیے استغفار کرنا چاہیے اور اس کی ثابت قدمی کے لیے دعا کرنا چاہیئے، جیسا کہ عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب میت کے دفن سے فارغ ہو جاتے تو اسکی قبر کے پاس کھڑے ہو کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرماتے "استغفروا لاخیکم وسلوا له بالتثبیت فانه الان یسأل" اپنے بھائی کے لیے استغفار کرو اور اس کی ثابت قدمی کے لیے دعا کرو، کیونکہ اسے اس وقت سوال کیا جائے گا۔ (سنن ابی داؤد بسند صحیح، کتاب الجنائز، باب الاستغفار عند القبر للمیت فی وقت الانصراف)

مذکورہ حدیث کی تشریح کرتے ہوئے علامہ شمس الحق عظیم آبادی اور علامہ عبید اللہ مبارکپوری رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ میت کو دفن کرنے کے بعد اس کے لیے مغفرت طلب کرنے اور اس کی ثابت قدمی کے لیے دعا کرنے کی مشروعیت پر یہ حدیث دلیل ہے۔

(عون المعبود ۹/ ۳۰ و مرعاۃ المفاتیح ۱/ ۲۳۰)

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اس استغفار و دعا کی ہیئت و کیفیت کیا ہونی چاہیے؟ اس سلسلے میں یہ حدیث ساکت ہے، جو لوگ مروجہ طریقے سے اجتماعی طور پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کے قائل ہیں وہ لوگ مندرجہ ذیل احادیث دلیل میں پیش کرتے ہیں۔

(۱) صحیح مسلم "کتاب الجنائز" کے اندر عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک طویل حدیث ہے جس میں مذکور ہے کہ ایک رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بقیع (قبرستان) گئے دیر تک کھڑے رہے پھر دونوں ہاتھ اٹھائے، تین مرتبہ آپ نے ایسا کیا، پھر گھر واپس آ گئے، عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرنے پر آپ نے فرمایا کہ "میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور فرمایا کہ تمہارا رب تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم بقیع کو جاؤ اور ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدیث زیارت قبور سے تعلق رکھتی ہے اور زیارت قبور کے وقت ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا سنت ہے، دفن میت کے بعد سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے دفن میت کے بعد مروجہ اجتماعی دعا پر اس سے استدلال کرنا غلط ہے۔

(۲) دوسری دلیل یہ دیتے ہیں کہ "**قال عمرو بن عاص لابنه وهو في سياق الموت ...... واذا انا مت فلاتصحبني نائحة ولا نار، فاذا دفنتموني، فشنوا علىّ التراب شناً، ثم اقيموا حول قبري قدر ما ينحر جزور ويقسم لحمها، حتى استانس بكم واعلم ما ذا اراجع به رسل ربي.**

مشہور صحابی عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ نے موت کے وقت اپنا بیٹا عبداللہ کو وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو میرے جنازہ کے ساتھ کوئی رونے والی عورت نہ جائے اور نہ آگ (مشعل) ساتھ میں لی جائے، اور جب تم لوگ مٹی ڈال کر مجھے دفن

کرنے سے فارغ ہو جاؤ تو میری قبر کے ارد گرد اتنی دیر تک کھڑے رہنا جتنی دیر میں ایک اونٹ ذبح کر کے اسکا گوشت تقسیم کرلیا جاتا ہے، تاکہ میں تمہارے ذریعہ انسیت حاصل کروں اور دیکھ لوں کہ اپنے پروردگار کے فرشتوں کو کیا جواب دیتا ہوں۔

اولاً عرض اینکہ عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی اس وصیت میں کہیں بھی اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ تم لوگ دفن کے بعد میرے لیے دعا کرنا یعنی نفس دعا ہی کا تو اس میں ذکر نہیں ہے، تو پھر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا یا امام ہاتھ اٹھا کر دعا مانگے اور ان کی دعا پر لوگ آمین کہتے جائیں اس کا دور سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے، لہذا دفن میت کے بعد مروجہ طریقے پر دعا مانگنے کی دلیل میں اس کو پیش کرنا غلط ہے۔

اس وصیت سے تو صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ دفن کے بعد میت کے قریبی رشتہ داروں کو کچھ دیر قبر کے ارد گرد کھڑے رہنا چاہیے یہاں پر ہاتھ اٹھانے کی بات آپ کو کہاں سے مل گئی؟۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ موقوف حدیث ہے یعنی ایک صحابی کا قول ہے اور راجح قول کے مطابق موقوف حدیث حجت نہیں ہے (تیسیر مصطلح الحدیث ص ۱۳۲)

(۳) تیسری دلیل یہ دیتے ہیں کہ حصین بن وحوح سے مروی ہے کہ طلحہ بن البراء رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا اور رات میں ان کے ورثہ نے ان کو دفن کر دیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر نہیں دیا، صبح جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ وسلم ان کی قبر کے پاس گئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے ساتھ صف بندی کر لیے پھر آپ ﷺ نے دونوں ہاتھ اٹھا کر یہ دعا کی "اللھم الق طلحة تضحک الیہ و ھو یضحک الیک"

یہ حدیث ضعیف ہے، کیونکہ اس کو امام طبرانیؒ نے "معجم کبیر" رقم الحدیث ۳۵۵۴ کے اندر عیسی بن یونس عن سعید بن عثمان البلوی عن عروۃ بن سعید الانصاری عن ابیہ عن

حصین بن وحوح'' کی سند سے روایت کیا ہے۔ علامہ ہیثمیؒ نے اسے حسن قرار دیا ہے لیکن چونکہ علامہ ہیثمی متساہل ہیں اس لیے ان کی بات کا کوئی اعتبار نہیں (مرعاۃ المفاتیح ۳۳/۴۶) سند پر غور کریں عروۃ بن سعید الانصاری اور ان کا باپ سعید دونوں مجہول ہیں (عون المعبود ۸/۳۰۲ و مرعاۃ المفاتیح ۵/۳۱۷) اور سعید بن عثمان البلوی کو حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے ''مقبول'' قرار دیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر انکی متابعت کی جائے تو ان کی حدیث لی جائے گی ورنہ وہ ضعیف الحدیث ہیں اور یہاں پر ان کا متابع نہیں ہے، کیونکہ امام بغوی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو روایت کرنے میں سعید بن عثمان البلوی منفرد ہیں (عون المعبود ۸/۳۰۲) اس اعتبار سے بھی یہ حدیث ضعیف ہورہی ہے، تفصیل کے لیے علامہ البانیؒ کی ''الضعیفہ'' رقم الحدیث ۳۲۳۲ کی طرف رجوع کریں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس حدیث کا بھی دفن میت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ طلحہ بن البراء کو رات میں دفن کر دیا گیا تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع نہیں دی گئی تھی، جسکی وجہ سے آپ ان کی قبر کے پاس گئے اور ہاتھ اٹھا کر دعا کی، اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو اجتماعی طور پر زیارت قبور کی دلیل ہوتی، تفصیلی حدیث ''الضعیفۃ'' للالبانی میں موجود ہے خواہش مند حضرات رقم الحدیث ۳۲۳۲ کی طرف رجوع کریں، لہذا اس حدیث سے دفن میت کے بعد مروجہ طریقے پر دعا مانگنے پر استدلال کرنا درست نہیں ہے۔

(۴) چوتھی دلیل یہ دیتے ہیں کہ امام ابونعیم اصفہانی نے ''حلیۃ الاولیا وطبقات الاصفیاء'' اور معرفۃ الصحابۃ'' کے اندر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ''**واللہ لکأنی اری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی غزوۃ تبوک و ھو فی قبر عبداللہ ذی البجادین وابو بکر و عمر، یقول:**

ادنيا منى اخاكما ، فاخذه من قبل القبلة حتى اسنده في لحده ثم خرج النبي صلى الله عليه وسلم و ولاهما العمل ، فلما فرغ من دفنه استقبل القبلة رافعاً يده يقول: اللهم انى امسيت عنه راضيا فارض عنه" وكان ذلک ليلاً فوالله لقد رأتني ولوددت انى مكانه ولقد اسلمت قبله بخمس عشرة سنة.

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کی قسم گویا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غزوہ تبوک میں دیکھ رہا ہوں، آپ عبداللہ ذوالبجادین کی قبر میں ہیں اور ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما بھی ہیں، آپ کہہ رہے ہیں کہ "تم دونوں اپنے بھائی کو میرے قریب کرو" پھر آپ نے ان کو قبلہ کی جانب سے پکڑا اور لحد میں رکھدیا، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم قبر سے نکلے اور بقیہ کام ان دونوں کے سپرد کردیا، پھر جب آپ ان کی تدفین سے فارغ ہوگئے تو قبلہ کی جانب منہ کرکے ہاتھ اٹھا کر یہ دعا کی "اے اللہ آج میں نے ان پر راضی ہوکر شام کی ہے لہذا تو بھی ان پر راضی ہوجا" عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ رات کا واقعہ تھا، اللہ کی قسم میں نے تمنا کی کہ کاش میں ان کی جگہ ہوتا، حالانکہ میں نے ان سے پندرہ سال قبل اسلام قبول کیا تھا۔

(حلية الاولياء و طبقات الاصفياء ۱۲۲/۱ ومعرفة الصحابة ۱۳۵/۳۔۱۳۶ رقم الحديث ۴۱۲۱۔ دیکھئے محدث بنارس اگست ۲۰۰۸ء ص ۳۴)

اس سند میں ایک راوی سعد بن صلت مجہول ہے (سلسلة الاحاديث الضعيفة والموضوعة للالبانی رقم الحدیث ۱۴۳۴) اس لیے یہ حدیث ضعیف ہے جو قابل حجت نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ حدیث اگر صحیح ہوتی تو دفن میت کے بعد انفرادی طور پر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کی دلیل ہوتی، امام ہاتھ اٹھا کر دعا کرے اور مقتدی حضرات ان

کی دعا پر آمین آمین کہتے جائیں اس کا ذکر اس حدیث میں نہیں ہے، لہذا دفن میت کے بعد مروجہ دعا کی دلیل میں اس کو پیش کرنا غلط ہے۔

واضح رہے کہ اس حدیث کو امام ابونعیم اصفہانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''معرفۃ الصحابۃ'' کے اندر عمرو بن عوف مزنی سے بھی روایت کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں ''ان عبداللہ ذا البجادین ھلک فی غزوۃ تبوک فذکر مثلہ وقال قال ابو بکر الصدیق : وددت واللہ انی صاحب الحفرۃ''

یعنی عمرو بن عوف مزنی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ ذوالبجادین غزوہ تبوک میں وفات پا گئے، پھر انہوں نے عبداللہ بن مسعود کی مذکورہ حدیث کے مثل حدیث بیان کی (جس میں قبلہ رخ ہو کر ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا ذکر ہے) اور انہوں نے کہا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: کہ اللہ کی قسم میری تمنا ہوئی کہ کاش میں یہ قبر والا ہوتا (معرفۃ الصحابۃ لابی نعیم اصفہانی رقم الحدیث ۴۱۲۲ و ۴۱۲۳ دیکھئے محدث بنارس اگست ۲۰۰۸ء)

یہ حدیث دو سندوں سے مروی ہے پہلی سند اخبرنا ابراھیم بن محمد الدیلی فیما اجازلی ، ثنا احمد بن زید بن ھارون القزاز عن ابراھیم بن المنذر حدثنی ابراھیم بن علی الرافعی حدثنی کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف عن ابیہ عن جدہ ان عبداللہ ذا البجادین ھلک فی غزوۃ تبوک......

دوسری سند: حدثنا سلیمان بن احمد فی المعجم الاوسط ثنا مسعدۃ بن سعد ثنا ابراھیم بن المنذر ثنا ابراھیم بن علی بن حسن بن ابی رافع ثنا کثیر بن عبداللہ عن ابیہ عن جدہ......

دونوں سندوں پر غور کریں اسکا مدار ابراہیم بن المنذر پر ہے اس کے بعد مسلسل

تین راوی ہیں ابراہیم بن علی بن حسن بن ابی رافع الرافعی، کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف المزنی اور عبداللہ بن عمرو بن عوف المزنی اس کے بعد صحابی عمرو بن عوف ہیں، اب مذکورہ تینوں رواۃ کے بارے میں محدثین عظام کا کلام ملاحظہ فرمائیے۔

پہلا راوی ابراہیم بن علی بن حسن بن ابی رافع الرافعی کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ ''تقریب التہذیب'' ص ۹۲ ترجمہ نمبر ۲۱۹ کے اندر فرماتے ہیں: ''نزیل بغداد، ضعیف من التاسعۃ'' یہ بغداد کے رہنے والے ہیں، جو ضعیف ہیں اور ان کا شمار نواں طبقہ کے رواۃ میں ہوتا ہے۔

اور ''تہذیب التہذیب'' ۱/۱۵۷ کے اندر فرماتے ہیں: امام ابن معینؒ فرماتے ہیں: لیس بہ باس، ان سے حدیث لینے میں کوئی حرج نہیں ہے، امام بخاری رح فرماتے ہیں: فیہ نظر، یہ ضعیف راوی ہے، امام دار قطنیؒ نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے، امام ابن عدیؒ نے ان کے بارے میں ''ہو وسط'' فرمایا ہے، امام ابن حبانؒ فرماتے ہیں کہ یہ اتنی غلطی کرتا ہے کہ اگر یہ منفرد ہو تو انکی حدیث حجت نہیں ہوگی، امام ابوحاتمؒ نے ان کے بارے میں ''شیخ'' فرمایا ہے، امام ساجیؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے محمد بن عروۃ بن ہشام سے ایک منکر حدیث روایت کی ہے، امام ابن الجوزیؒ نے اپنی کتاب ''الضعفاء'' کے اندر اور قاضی ابوالولید نے ان کو جھوٹا قرار دیا ہے۔

دوسرا راوی کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف المزنی کے بارے میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ ''تقریب التہذیب'' ص ۴۶۰ رقم الترجمۃ ۵۶۱۷ کے اندر فرماتے ہیں کہ یہ ضعیف راوی ہے جنہوں نے ان کو جھوٹا قرار دیا ہے انہوں نے مبالغہ سے کام لیا ہے اور ''تہذیب التہذیب'' ۴/۵۵۹۔۵۶۰ کے اندر فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حنبلؒ نے ان کو ''منکر الحدیث لیس بشیٔ'' کہا ہے یعنی یہ بہت ہی ضعیف راوی ہے، امام یحیٰ بن معینؒ نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے اور ایک مرتبہ انہوں نے فرمایا: لیس بشیٔ'' یہ

کچھ بھی نہیں ہے، امام شافعی اور امام ابوداؤد رحمہما اللہ نے ان کو جھوٹا قرار دیا ہے، امام ابوزرعہؒ فرماتے ہیں کہ واہی الحدیث لیس بقوی' یہ بہت ہی ضعیف راوی ہے، امام ابو حاتمؒ فرماتے ہیں کہ ''لیس بالمتین'' یہ مضبوط راوی نہیں ہے، امام نسائیؒ اور امام دار قطنی رحمہما اللہ نے ان کو متروک قرار دیا ہے۔ امام نسائیؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ یہ ثقہ نہیں ہے، امام ابن حبانؒ فرماتے ہیں وہ ''عن ابیہ عن جدہ'' کی سند سے ایک موضوع صحیفہ روایت کرتا ہے، ان کا تذکرہ نہ کتابوں میں کرنا جائز ہے اور نہ ان سے روایت کرنا جائز ہے، ہاں تعجب کے طور پر ذکر کیا جا سکتا ہے، امام علی بن مدینیؒ نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے، امام ابن سعد فرماتے ہیں کہ وہ قلیل الحدیث اور ضعیف ہے، امام ابن السکنؒ فرماتے ہیں کہ ''عن ابیہ عن جدہ'' کی سند سے وہ ایک صحیفہ روایت کرتا ہے جس کے تمام احادیث ضعیف ہیں، امام حاکمؒ فرماتے ہیں کہ وہ ''عن ابیہ عن جدہ'' کی سند سے ایک کتاب روایت کرتا ہے جس کے تمام احادیث منکر ہیں، امام ساجیؒ نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے اور امام ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں کہ ان کے ضعف پر محدثین کا اجماع ہے۔ اور حافظ ذہبی نے ''میزان الاعتدال'' کے اندر ان کو ذکر کر کے ان پر سخت جرح کی ہے (میزان الاعتدال ۵/۴۹۳)

تیسرا راوی عبداللہ بن عمرو بن عوف مزنی کو امام ابن حبانؒ نے ''الثقات'' کے اندر ذکر کیا ہے (تہذیب التہذیب ترجمہ نمبر ۴۰۵۹) اور حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے ان کے بارے میں ''مقبول من الثالثة'' کہا ہے جس کا مطلب خود ان کی تشریح کے مطابق یہ ہے کہ " مقبول حیث یطابع والافلین الحدیث " اگر ان کی متابعت کی جائے تو ان کی حدیث لی جائے گی ورنہ وہ ضعیف ہیں، (مقدمہ تقریب التہذیب) اور یہاں پر کسی نے ان کی متابعت نہیں کی ہے اس اعتبار سے ان کی یہ حدیث غیر مقبول ہوتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ مسلسل تین راویوں کے ضعیف ہونے کی وجہ سے یہ حدیث سخت ضعیف ہے اس لیے اس سے دلیل پکڑنا اور کسی حدیث کے شاہد کے طور پر اسے پیش کرنا جائز نہیں ہے۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ دفن میت کے بعد مروجہ اجتماعی دعا کے سلسلے میں کوئی بھی صحیح حدیث نہیں ہے اس لیے یہ غیر ثابت شدہ عمل ہے۔

معزز قارئین! مذکورہ تفصیلات سے روز روشن کی طرح عیاں ہوگیا کہ میت کو دفن کرنے کے بعد اس کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر اس کے لیے استغفار اور ثابت قدمی کی دعا کرنا سنت ہے۔ واضح رہے کہ دعا ایک عبادت ہے اور عبادت جہاں پر جس طرح ثابت ہے وہاں پر اسی طرح ادا کرنا ضروری ہے۔ اور قرآن وحدیث میں جہاں صرف دعا واستغفار کا ذکر ہے اور ہاتھ اٹھانے کا ذکر نہیں ہے وہاں بغیر ہاتھ اٹھائے دعا مانگنا مراد ہے مثلاً وضوء کے بعد، مسجد میں داخل ہوتے اور نکلتے وقت، قضاء حاجت کے لیے جاتے اور اس سے فراغت کے وقت، کپڑا پہنتے وقت، سوتے اور جاگتے وقت اور کھانے کے بعد وغیرہ ٹھیک اسی طرح دفن میت کے بعد صرف دعا کا ذکر ہے تو یہاں بھی بغیر ہاتھ اٹھائے دعا کرنا مراد ہوگا۔ اور جہاں تک تدفین کے بعد مروجہ اجتماعی دعا کا تعلق ہے یعنی ایک آدمی ہاتھ اٹھا کر دعا کرے اور بقیہ لوگ اس کی دعا پر آمین آمین کہتے جائیں تو دعا کی یہ ہیئت وکیفیت کسی بھی صحیح یا ضعیف حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

Bidati Duaon
Se
Bacheye